معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۶ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۵ء عدد ۶

فہرست مضامین

مقالات

وفیات

☆☆☆☆☆☆

شذرات

مسلمانوں کے لئے دسمبر کا مہینہ غم والم کا مہینہ بن گیا ہے ۶/ دسمبر کی تاریخ آتی ہے تو ان کا زخم ہرا ہو جاتا ہے، اور بابری مسجد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور وہ اس روز یومِ غم مناتے ہیں، اس سال بھی بعض لوگوں نے بابری مسجد کی تیسری برسی منانے اور احتجاج کرنے کے مروجہ طریقے اختیار کرنے یعنی بازوؤں پر کالی پٹی باندھنے، گھروں پر سیاہ جھنڈے لگانے اور جلسے جلوس کرکے قرار دادیں پاس کرنے کا فیصلہ کیا، کیرالا کے بعض پرجوش لوگوں نے اجودھیا کی طرف مارچ کا پروگرام بھی بنایا تاکہ شہید بابری مسجد کی جگہ پر نماز ادا کریں۔ بلاشبہ بابری مسجد اور اس کی لپیٹ میں اجودھیا کی کئی اور مسجدوں کی شہادت کا واقعہ نہایت غیر معمولی، سخت جاں گسل اور بڑا روح فرسا ہے جس کو بھلایا نہیں جاسکتا، لیکن غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا نوحہ و غم کے اظہار، آہ و فریاد اور نالہ و شیون کرنے سے کوئی بات بن سکتی ہے؟ یا ہنگامہ و احتجاج کے پٹے پٹائے طریقے اختیار کرنے سے بابری مسجد دوبارہ تعمیر ہو سکتی ہے؟ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس طرح کے احتجاج کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کہیں یہ سب طریقے دوسروں کے تشبّہ کے ضمن میں تو نہیں آتے۔

عموماً ان اوچھے طریقوں کا اعلان جن لوگوں کی جانب سے ہوتا ہے، ان کی سوجھ بوجھ، بصیرت اور معاملہ فہمی بھروسہ کے قابل نہیں ہوتی، یہ لوگ غیر ذمہ دارانہ بیان دے کر خود پیچھے رہ جاتے اور غائب ہو جاتے ہیں مگر ان کے بیان کی ہل چل سے فضا گرم ہو جاتی ہے اور سادہ لوح لوگ مشتعل اور بے قابو ہو جاتے ہیں جس کا انہیں زبردست خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اس سے فرقہ پرستوں کی بھی بن آتی ہے جو اس طرح کے مواقع کی تاک میں رہتے ہیں تاکہ ہنگامہ و فساد کرکے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلیں۔ یہ بھی بعید نہیں ہے کہ خود فرقہ پرست اور شر پسند لوگ ہی مسلمانوں کے ہمدرد بن کر ان کے ناعاقبت اندیش اور بے بصیرت لوگوں کو غیر ذمہ دارانہ اور ہل چل مچانے والے بیان دینے پر آمادہ کرتے ہوں، بات جو بھی ہو مسلمانوں کو ایسے لاطائل بے سود اور بے نتیجہ اقدامات کرکے اپنی تباہی کا سامان خود نہیں کرنا چاہئے۔ ان اوچھے طریقوں سے الٹے وہ نقصان اٹھاتے اور مزید پسپا اور کمزور ہوتے ہیں اور دوسرے فائدہ اٹھاتے اور طاقت ور ہوتے ہیں، ماتم و شیون اور فریاد و احتجاج بیدار مغز قوموں کا شیوہ و دستور نہیں، زندہ قومیں گذشتہ واقعات سے سبق حاصل کرتی ہیں، ماضی کی تاریکیوں سے حال و مستقبل کے لئے روشنی حاصل

کرتی ہیں، تخریب سے تعمیر کی راہیں نکالتی ہیں، خرابی سے خوبی اور ناکامی سے کامرانی کی منزلیں طے کرتی ہیں اور جوش عمل سے سرشار ہو کر یہ کہتی ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم   مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

بابری مسجد کی شہادت مسلمانوں کو اس امر کی دعوت دیتی ہے کہ وہ سوچیں اور غور کریں کہ کیا اسباب و حالات تھے کہ ان کی پانچ سو برس قدیم مسجد ڈھا دی گئی اور وہ اس کا تحفظ تو درکنار اس کے لئے فریاد و احتجاج کرنے کے قابل بھی نہیں رہے، حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کو الزام دینے کے بجائے وہ اپنے ہی کو مورد الزام قرار دیں اور یہ واقعہ ہے کہ دوسروں کی جارحیت اور ظلم و تعدی سے زیادہ مسلمانوں کی کمزوری اور کوتاہی کی وجہ سے مسجد شہید ہوئی۔ افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس عظیم الشان حادثہ کے بعد بھی مسلمانوں نے کوئی سبق نہیں لیا، اب بھی ان کی غفلت، سرمستی، خود فراموشی اور خدا فراموشی کا وہی حال ہے، وہ نہ اپنے حالات و معاملات کی اصلاح کے لئے فکرمند ہوئے اور نہ انہیں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی تلافی کا کوئی خیال ہو رہا ہے، بابری مسجد کی بازیابی کے لئے ان کی نگاہیں ملک کی سیاسی جماعتوں کی جانب اٹھتی ہیں لیکن اس خدائے حی و قیوم کی جانب وہ نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا گوارا نہیں کرتے جس کے قبضۂ قدرت میں یہ پوری کائنات ہے اور جس کی مرضی کے بغیر دنیا کا ایک پتہ بھی حرکت نہیں کرتا، اپنی صلاح و فلاح کے منصوبے بنا کر اپنی قوت و طاقت کو بڑھانے کے بجائے اپنے اختلاف و انتشار کو بڑھا کر اپنی ہوا خیزی کر رہے ہیں، کیا عجیب بات ہے کہ جو چیز خود ان کے پاس موجود ہے، اس کی طلب دوسروں سے کر رہے ہیں۔

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد   آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

جناب محمود الرحمن صاحب کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونے پر قوم نے اطمینان کا سانس لیا تھا، خیال تھا کہ وہ اپنے تجربہ اور دور اندیشی سے یونیورسٹی کے بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور پڑھنے پڑھانے کا ماحول از سر نو قائم ہو جائے گا۔ لیکن گذشتہ ماہ پیش آنے والے واقعات نے ثابت کیا کہ ابھی یہ توقع پوری ہونے کا وقت نہیں آیا ہے۔ اس کی وجہ سے یونیورسٹی کے ہمدرد اور دردمند لوگ متفکر اور پریشان ہیں، دراصل ان ہنگاموں کے پس پردہ خود غرض، مفاد پسند اور جاہ و اقتدار کے متوالوں کی وہی ٹولی ہے جس کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے یونیورسٹی میں آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا ہوتا رہا ہے،

یہ لوگ حالات کو معمول پر نہیں آنے دینا چاہتے کیونکہ اس سے ان کے استحصال کے راستے بند ہوجائیں گے، ان کے اثر و رسوخ اور اقتدار و اختیار کا خاتمہ ہوجائے گا اور وہ اپنی من مانی نہیں کر سکیں گے۔ یہی ٹولی یونیورسٹی کے ہنگامہ و انتشار کی ذمہ دار پہلے بھی رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

طلبہ اپنے خام اور ناپختہ ذہن کی وجہ سے بہت جلد ان تخریب کاروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور ہر قسم کا ہنگامہ و تشدد برپا کرنے لگتے ہیں، وائس چانسلر صاحب ان کی خاموشی کے اندر پوشیدہ طوفان کو نہیں بھانپ سکے اور اپنی نیکی اور شرافت کی بنا پر خیال کرلیا کہ "سب خیریت ہے" اگر انہوں نے گذشتہ واقعات اور حالات کا جائزہ لیا ہوتا تو ان کو خرابیوں اور فتنوں کے سرچشمہ کا پتہ پہلے ہی چل جاتا اور وہ اول روز ہی سے اس شجرہ فساد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی فکر میں لگ گئے ہوتے تو وہ اسطرح برگ و بار نہ لاتا۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، شورش پسند اور شر و فساد پر آمادہ طلبہ کا اخراج کرکے انہوں نے قابلِ ستائش اور مستحسن قدم اٹھایا ہے، اب انہیں کسی دباؤ میں آکر ان کے معاملے میں کوئی نرمی اور رو رعایت نہیں کرنی چاہیے بلکہ یونیورسٹی کے وسیع تر مفاد میں دوسرے شعبوں میں بھی گھسے ہوئے مفسد عناصر کی بیخ کنی لازما کرنی چاہیے تاکہ یونیورسٹی کو روز روز کے خرخشوں سے نجات ملے اور مسلمانوں کا یہ قیمتی سرمایہ چند خود غرض لوگوں کی وجہ سے تباہ و برباد نہ ہو۔ ہنگامی حالات کی وجہ سے یونیورسٹی غیر معینہ مدت کے لئے بند ہوگئی تھی، خوشی ہے کہ وہ دسمبر کے وسط سے مرحلہ وار کھولی جارہی ہے۔

جناب عابد رضا بیدار کی سربراہی میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی سرگرمیاں عروج پر ہیں، اس وقت یہ لائبریری ایک بڑا اشاعتی مرکز ہوگئی ہے، جو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اردو کی معیاری اور کلاسیکل کتب و رسائل شائع کرکے اصحاب علم و ذوق کی تشنگی بجھارہی ہے، حال میں لائبریری نے اپنی یہ تازہ مطبوعات دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کو نذر کی ہیں جن کے لئے ہم شکر گذار ہیں۔

(۱) اردو غزل ۱۹۴۰ء کے شعرا کے خاطر میں (۲ و ۳) کچھ غالب کے بارے میں حصہ اول و دوم (۴) جہانِ غالب (۵) آثار غالب (۶) کلام شاد (۷) سکوں پر اشعار (۸ و ۹) مشاہیرِ ادب اردو حصہ اول و دوم (۱۰) قواعد اردو (۱۱) پریم چند متفرقات (۱۲) کچھ شاد عظیم آبادی کے بارے میں (۱۳) عبدالحق بحیثیت محقق۔

امید ہے کہ اس خوان ترو تازہ سے علمی و ادبی ذوق رکھنے والے اپنے کام و دہن کو لذت یاب کریں گے۔

اس سے پہلے یہ اطلاع دی جا چکی ہے کہ شیخ محمد ناصر العبودی نے دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کا مراسلاتی ممبر بننے کی دعوت قبول کرتے ہوئے اپنی سات تصنیفات مرحمت فرمائی ہیں، اب پاکستان کے موقر بین الاقوامی ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے اپنے ۲۵/ ستمبر کے گرامی نامہ میں اطلاع دی ہے کہ انہوں نے بھی دارالمصنفین کا عضو مراسل بننا قبول کرلیا ہے جس کے لئے کارکنانِ دارالمصنفین ان کے بے حد شکر گذار ہیں۔

مقالات

تدوین فتاویٰ

عہد بہ عہد

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

عربی زبان و لغت کے بہت سے الفاظ اسلامی دور میں اپنے قدیم اور اصلی معنی و مفہوم کے بجائے اسلامی مفہوم و معنی میں استعمال کیے جانے لگے اور ان کی حیثیت اسلامی اصطلاح کی ہوگئی، صلوٰۃ، صیام، زکوٰۃ، حج وغیرہ اسی قبیل سے ہیں، اسی طرح لفظ فتی اپنے قدیم معنی میں (باب سمع سے) نوجوانی، کریم النفس اور نجابت و سخاوت کے معنی میں تھا، مگر اسلام میں دینی معلومات حاصل کرنے کرانے کے لیے بولا جانے لگا، استفتاء سوال کرنے اور افتاء جواب دینے کے لیے بطور اصطلاح مستعمل ہوا، قرآن مجید کی ایک آیت میں یہ دونوں الفاظ آئے ہیں:

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ	لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں (استفتا
فِي الْكَلَالَةِ ؕ	کرتے ہیں) آپ فرما دیں کہ اللہ تم کو کلالہ کے
(سورۂ نساء ۴: ۱۷۷)	بارے میں حکم دیتا ہے (فتویٰ دیتا ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موقع بہ موقع یہ دونوں الفاظ استعمال فرمائے ہیں، استفت قلبک (اپنے دل سے فتویٰ معلوم کرو) وان افتاک وافتوک (اگرچہ کوئی شخص اور لوگ تم کو فتویٰ دیں) وغیرہ۔

دینی امور میں استفتاء اور سوال کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل ۱۶: ۴۳) — تم لوگ اہل علم سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے ہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اذا شک احدکم فی الامر فلیسئلنی عنہ — جب تم میں سے کوئی دینی امر میں شک کرے تو اسکے بارے میں مجھ سے سوال کرے۔

البتہ غیر ضروری اور بیجا سوال کرنے سے شدت سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ جنگ و جدال اور تباہی کا باعث ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید الفقہا والمفتیین تھے، آپ کی ذات اقدس فقہ وفتویٰ میں مرجع تھی، نیز خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم فتویٰ دیا کرتے تھے، انکے علاوہ صحابہ میں جو لوگ کتاب وسنت کے ممتاز عالم تھے اور قراء کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے وہ بھی بوقت ضرورت یہ خدمت انجام دیتے تھے، خاص طور سے یہ سات حضرات مشہور تھے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، امام ابن قیم کا قول ہے کہ ان حضرات میں سے ہر ایک کے فتاوے علیحدہ علیحدہ ضخیم جلدوں میں جمع کیے جاسکتے ہیں۔

ان سات اہل فقہ وفتویٰ میں سے تین حضرات کے تلامذہ واصحاب نے ان کے فقہی مسلک کی نشر واشاعت کی، حضرت زیدؓ بن ثابت کے شاگردوں نے مدینہ منورہ میں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اصحاب نے مکہ مکرمہ میں، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

کے تلامذہ نے کوفہ میں اپنے اپنے شیخ کے فقہ وفتویٰ کو عام کیا، تفصیل کے لیے یوسف بن عبدالبر اندلسی کی کتاب جامع بیان العلم ج ۲، ص ۶۱ و ۶۲، اور ابن قیم کی کتاب اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۸ تا ۲۲ ملاحظہ ہو۔

امام الفقہاء والمحدثین حضرت علی بن عبداللہ مدینی متوفی ۲۳۴ھ نے اس کی تفصیل اپنی کتاب میں یوں بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلک فقہ و فتویٰ کے حامل آخر میں طبقۂ صحابہ میں تین حضرات تھے، عبداللہ بن مسعودؓ زید بن ثابتؓ اور عبداللہ ابن عباسؓ، ان ہی تینوں حضرات کے اصحاب وتلامذہ ان کے مسلک پر فتویٰ دیتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت اور فتویٰ پر یہ چھ حضرات عمل کرتے تھے، علقمہ بن قیس، اسود بن یزید، مسروق بن اجدع، عبیدہ سلمانی، حارث ابن قیس، عمرو بن شرحبیل رحمہم اللہ اور ان چھ حضرات کے تلامذہ ابراہیم نخعی، اعمش، ابو اسحاق، سفیان ثوری، یحییٰ بن سعید القطان رحمہم اللہ نے اپنے اپنے شیخ کے مسلک کے مطابق فقہ وفتویٰ کی خدمت انجام دی۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مسلک پر یہ حضرات فتویٰ دیتے تھے، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان، مجاہد بن جبیر، جابر بن زید، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، سعید بن جبیر، عمرو بن دینار، ابن جریج، سفیان بن عیینہ رحمہم اللہ۔

اور حضرت زید بن ثابت کے فقہی مسلک پر فتویٰ دینے والے یہ بارہ حضرات تھے، سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، قبیصہ بن ذویب، خارجہ بن زید بن ثابت، سلیمان بن یسار، ابان بن عثمان بن عفان، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ، قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق، سالم بن عبداللہ بن عمر، ابوبکر بن عبدالرحمن، طلحہ بن عبداللہ بن عوف، نافع بن

جبیر بن مطعم رحمہم اللہ یہ سب حضرات مدینہ منورہ کے اصحاب فقہ و فتویٰ تھے، انکے بعد امام محمد بن شہاب زہری اس مسلک کے سب سے بڑے عالم تھے، انکے بعد امام مالک اور ان کے بعد عبدالرحمٰن بن مہدی اس کے امین و ترجمان تھے۔

مذکورہ بالا فقہاء میں سے فقہائے سبعہ فتویٰ میں حجت کا درجہ رکھتے تھے اور حوادث و نوازل میں جب تک یہ حضرات متفقہ فتویٰ صادر نہیں کرتے تھے، ان کے بارے میں مدینہ کے قاضی اپنا فیصلہ صادر نہیں کرتے تھے، ایک شاعر نے ان کے نام یوں جمع کیے ہیں:

اذا قیل من فی العلم سبعة ابحر　　روایتهم لیست عن العلم خارجه

فقل هم عبید الله عروة، قاسم　　سعید ابوبکر، سلیمان، خارجه

مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور کوفہ کے اصحاب فقہ و فتویٰ کا یہ مختصر سا جائزہ ہے، تفصیل کے لیے امام علی مدینی کی کتاب علل الحدیث و معرفة الرجال ص ۴۲ تا ۵۱ اور امام ابن قیم کی اعلام الموقعین، ج ۱، ص ۹ تا ۲۴ ملاحظہ ہو:

اسی طرح بصرہ، شام، مصر، یمن، بغداد اور دوسرے اسلامی بلاد و امصار میں اصحاب فقہ و فتویٰ اپنے اپنے شیوخ و اساتذہ کے مسلک کے مطابق کتاب و سنت اور سنن ماضیہ کی روشنی میں فتویٰ کی خدمت انجام دیتے تھے۔

فتاویٰ کے جمع و تالیف کا سلسلہ کسی نہ کسی حد تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں شروع ہوگیا تھا، متعدد صحابہ نے آپ کی حیات میں احادیث کے صحیفے اور مجموعے لکھے، ان میں آپ کے احکام، اوامر، نواہی، مرضیات بھی تھے جن کو آپ نے خود بیان فرمایا، یا صحابہ کے سوال (استفسار) کے جواب میں جو باتیں بیان

فرمائیں وہ سب آپ کے فتاوے ہیں، بلکہ احادیث کا ذخیرہ زیادہ تر فتاویٰ نبویہ پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے قضایا و فتاوے ان کے تلامذہ و متبعین نے اپنے صحیفوں اور مجموعوں میں درج کیے جن میں احادیث رسول کے ساتھ فتاوے اور قضایا بھی تھے، اس دور تک کے نوشتوں کا یہی حال تھا، پہلی صدی کے خاتمہ پر حضرت عمر بن عبدالعزیز متوفی ۱۰۱ھ رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث اور سنن ماضیہ کے جمع و تدوین کی طرف خاص توجہ فرمائی اور تمام امراء و عمال کو لکھ کر اس کی تاکید کی، مدینہ منورہ کے امام محمد بن شہاب زہری متوفی ۱۲۴ھ کو اس کا ذمہ دار مقرر کیا، انہوں نے بوجوہ احسن یہ خدمت انجام دی، اسی لیے کہا گیا ہے کہ علم اور حدیث کو سب سے پہلے امام زہری نے مدون کیا، اس دور کی مدونات میں احادیث رسول کے ساتھ صحابہ تابعین اور تبع تابعین کے فتاوے بھی درج تھے، اسی طرح پہلی صدی میں احادیث و آثار اور فتاوے غیر مرتب شکل میں جمع ہوگئے تھے۔

اس کے بعد دوسری صدی کے وسط تک عالم اسلام کے ہر مرکزی شہر میں ائمۂ فقہ و فتویٰ اور محدثین نے کتابیں فقہی ترتیب پر لکھیں، مکہ مکرمہ میں ابن جریج متوفی ۱۵۰ھ، مدینہ منورہ میں محمد بن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ یا امام مالک متوفی ۱۷۹ھ بصرہ میں ربیع بن صبیح متوفی ۱۶۰ھ یا سعید بن ابی عروبہ متوفی ۱۵۶ھ یا حماد بن سلمہ متوفی ۱۷۶ھ، کوفہ میں سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ، شام میں عبدالرحمٰن اوزاعی متوفی ۱۵۶ھ، واسط میں ہشیم بن بشیر متوفی ۱۸۸ھ، یمن میں معمر بن راشد متوفی ۱۵۳ھ، رے میں جریر بن عبدالحمید متوفی ۱۸۸ھ، خراسان میں عبداللہ ابن مبارک متوفی ۱۸۱ھ

رحمہم اللہ نے اپنے اپنے فقہی مسلک کے مطابق کتابیں لکھیں جن میں احادیث و آثار اور صحابہ و تابعین کے قضایا و فتاوے بھی درج تھے۔

اس کے بعد تیسری صدی میں احادیث رسولؐ اور صحابہ و تابعین کے فتاوے پر علیحدہ علیحدہ مستقل تصانیف کی ابتدا ہوئی اور فتاوے گویا فقہ کی ایک صنف کے طور پر جمع کیے گئے، ہمارے علم میں اس سلسلہ میں نہایت مفید اور ضخیم کتاب اندلس کے امام بقی بن مخلد قرطبی متوفی ۲۷۶ھ رحمۃ اللہ علیہ نے تصنیف کی، احمد بن یحییٰ ضبی اندلسی نے ان کی تصانیف کے ذکر میں لکھا ہے:

ومنها مصنفه فی فتاوی الصحابة	ان کی تصانیف میں صحابہ و تابعین وغیرہ
والتابعین ومن دونهم الذی	کے فتاوے میں کتاب المصنف ہے جس میں
اربی فیه علی مصنف ابی بکر بن	وہ مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ، مصنف
ابی شیبة ومصنف عبد الرزاق	عبد الرزاق ابن ہمام اور مصنف سعید بن
ابن همام ومصنف سعید بن	منصور وغیرہ سے بہت آگے ہیں اور انہیں
منصور وغیرها، وانتظم علماً	بہت زیادہ علم جمع کیا ہے۔
عظیما (بغیة الملتمس ص ۲۳ طبع لیڈن)	

امام بقی بن مخلد کی اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ان کے تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر خاص طور سے کیا ہے، شمس الدین داؤدی مصری نے لکھا ہے:

وله تواليف فی فتاوی الصحابة	صحابہ و تابعین وغیرہ کے فتاوی میں انکی
والتابعین فمن دونهم اربی	تالیفات ہیں جن میں وہ مصنف عبدالرزاق
فیه علی مصنف عبد الرزاق	اور مصنف ابن ابی شیبہ سے بہت آگے ہیں

وابن ابی شیبة (طبقات المفسرین ج ۱ ص ۱۱۸)

مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ ہمارے زمانہ میں آٹھ آٹھ، دس دس ضخیم جلدوں میں چھپ گئی ہیں جن میں احادیث کے ساتھ فتاوے بھی ہیں، مگر بقی بن مخلد کی کتاب ان کے مقابلہ میں صحابہ و تابعین وغیرہم کے فتاوے کا دائرۃ المعارف ہے۔

اس دور میں صحابہ و تابعین کے فتاوے دوسرے علماء نے بھی جمع کیے، خلیفہ مامون کے پڑپوتے امام ابوبکر محمد بن موسیٰ نے حضرت عبداللہ بن عباس کے فتاوے بیس جلدوں میں جمع کیے، علامہ ابن حزم اندلسی کا بیان ہے:

منهم الفقیه المحدث الشافعی	مامون کی اولاد میں شافعی فقیہ و محدث
محمد بن موسیٰ بن یعقوب بن	محمد بن موسیٰ بن یعقوب بن مامون ہیں،
المامون، مات بمصر، وله	ان کا انتقال مصر میں ہوا اور انکی تصنیفات
تواليف منها فقه عبد الله	ہیں، ان میں سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ
ابن عباس رضی الله عنهما	عنہما کی فقہ میں کتاب ہے جس کو فقہی
فی جزء علی ابواب الفقه فی	تقسیم کرکے بیس جلدوں میں لکھا ہے۔
عشرین کتاباً (جمهرة انساب العرب ۳۲)	

امام ابن قیم نے ابن حزم کے حوالہ سے یوں لکھا ہے:

قال: وقد جمع ابوبکر محمد بن	ابوبکر محمد بن موسیٰ بن یعقوب بن
موسیٰ بن یعقوب بن امیر المومنین	امیر المومنین نے ابن عباس رضی اللہ عنہ
فتیا ابن عباس رضی الله عنه	کے فتویٰ کو بیس جلدوں میں جمع کیا ہے،
فی عشرین کتاباً، وابوبکر المذکور	یہ ابوبکر علم دین اور حدیث میں ائمۂ اسلام

احد ائمۃ الاسلام فی العلم	میں سے ہیں۔
والحدیث (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۹)	

اور امام محمد بن نوح عجلی متوفی ۲۱۸ھ نے امام ابن شہاب زہری کے فتاوے فقہی ابواب پر تین ضخیم جلدوں میں مرتب کیے، ابن قیم کا بیان ہے :

وجمع محمد بن نوح فتاویہ فی	محمد بن نوح نے امام زہری کے فتاوے کو
ثلاثۃ اسفار ضخمۃ علی ابواب	تین ضخیم جلدوں میں جمع کیا ہے۔
الفقۃ (〃 ج ۱ ص ۱۸)	

امام محمد بن نوح عجلی ناصر السنۃ فتنۂ خلق قرآن میں امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ قید کرکے خلیفہ مامون کے پاس مقام رقہ میں بھیجے گئے، مگر راستہ ہی میں ان کا انتقال عین جوانی میں ہوگیا اور امام احمد نے ان کی تجہیز و تکفین فرمائی۔

مشہور امام لغت و ادب احمد بن فارس متوفی ۳۹۵ھ کی تصانیف میں ایک کتاب 'فتاوی فقیہ العرب' ہے، یہ معلوم نہ ہوسکا کہ فقیہ العرب کس بزرگ کا لقب ہے، فتویٰ نویسی نے اس دور میں اور اس کے بعد کافی ترقی کی اور ائمۂ فقہ و حدیث کے فتاوے ان کے تلامذہ اور منتسبین نے جمع کیے، امام احمد بن حنبل اپنے اقوال و آرا اور فتاوی کے لکھنے کے سخت مخالف تھے مگر ان کے شاگرد حبیش بن سندی نے دو جلدوں میں ان کے نادر فتاوے اور مسائل جمع کیے اور ابوبکر خلال (احمد بن محمد بن ہارون) متوفی ۳۱۱ھ نے پوری زندگی امام احمدؒ کے مسلک کے جمع و ترتیب میں بسر کی اور اپنی کتاب الجامع الکبیر میں امام صاحب کے آرا و اقوال اور فتاوے و مسائل مرتب کیے یہ کتاب تقریباً بیس جلدوں میں تھی اسی طرح دوسرے اہل علم اور اہل فقہ و فتویٰ کے فتاوے مدون

و مرتب ہوتے رہے، حتیٰ کہ فقہاء و محدثین نے اپنے فتاوے خود مرتب کیے اور اسکا رواج عام ہوا۔

امام بغوی (ابو محمد حسین بن مسعود شافعی) متوفی ۵۱۶ھ نے اپنے فتاوے خود جمع کیے اور ان کی زندگی ہی میں قاضی حسین نے ان سے مزید فتاوے حاصل کرکے اس پر تعلیق کی، یہ کتاب اہل علم میں بہت مشہور تھی (طبقات المفسرین ج ۱ ص ۱۵۸)

سلطان العلماء ابو محمد عزالدین بن عبدالعزیز سُلمی متوفی ۶۶۰ھ نے اپنے فتاوے مرتب کیے، ان کی تصانیف میں کتاب الفتاوی الموصلیہ کے نام ہیں، اس دور میں امام ابن تیمیہؒ کے فتاوے رسائل کی حیثیت رکھتے تھے جن کو مرحوم سلطان سعود نے تیس سے زائد ضخیم جلدوں میں شایع کیا ہے، امام تقی الدین علی بن عبدالکافی سُبکی متوفی ۷۵۶ھ نے دو جلدوں میں اپنے فتاوے لکھے جن میں ان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے شامل تھے جو خاص خاص استفتاء کے جواب میں لکھے گئے تھے امام جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے الحاوی للفتاوی کے نام سے اپنے فتاوے کتابی شکل میں جمع کیے، اس میں بھی ان کے رسائل و کتب ہیں، یہ کتاب دو جلدوں میں مصر میں چھپ گئی ہے، کل صفحات ساڑھے گیارہ سو کے قریب ہیں۔

تاتاری غارت گری کے بعد علمائے اسلام نے علم دین کے احیاء و تجدید کی مہم شروع کی اور حدیث، فقہ، رجال، تاریخ، طبقات اور دوسرے علوم میں بے شمار کتابیں تصنیف کیں، اس زمانہ میں بہت سے صاحب تصانیف کثیرہ علماء و محدثین پیدا ہوئے، جنھوں نے فتاوے کے جمع و تالیف کی شاندار خدمات انجام دیں اور شام مصر خراسان اور ماوراء النہر کے فقہاء نے خاص طور پر فقہ و فتویٰ میں کتابیں لکھیں کتابو

کے شروح و حواشی لکھے، کشف الظنون اور ہدیۃ العارفین وغیرہ سے ان کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے۔

ہندوستان میں فتاویٰ کی تدوین و تالیف کی ابتدا کب ہوئی؟ اس کی تعیین نہیں ہو سکی، یہاں کا چار سو سالہ ابتدائی اسلامی دور عرب حکمرانوں کا تھا اور یہاں کے اہل علم کے تصنیفی و تدریسی کارناموں کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے، اس کے بعد غزنوی اور غوری دور میں علما و مشائخ کی کثرت ہوئی اور ان کے دور میں فقہ اور معقولات کا زور رہا، ہمارے علم میں فتاویٰ نویسی کا سلسلہ خلجی دور سلطنت میں شروع ہوا اور سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی متوفی ۶۹۵ھ کے دور میں دو عظیم فتادے مدون ہوئے، ایک کتاب سلطان موصوف کے حکم سے ملا محمد عطاری نے فوائد فیروز شاہی کے نام سے فارسی زبان میں لکھی اور دوسری کتاب مولانا عالم بن علاء اندرپتی دہلوی نے عربی زبان میں زاد السفر کے نام سے تصنیف کی سلطان کی خواہش تھی کہ یہ کتاب بھی اس کے نام سے منسوب ہو مگر امیر تاتارخان سے خصوصی تعلق کی بنا پر مولانا نے اسی کے نام پر معنون کیا اور فتاویٰ تاتارخانیہ کے نام سے مشہور ہوئی، جو فقہ حنفی کی عظیم کتاب ہے، حکومت ہند کے زیر اہتمام اس کی طباعت ہو رہی تھی اور تین ضخیم جلدیں شایع ہوئیں، غالباً پوری کتاب آٹھ جلدوں میں مکمل ہوگی، اللہ تعالیٰ اس کی طباعت و اشاعت کا سامان مہیا کر دے۔

اس کے بعد بہت سے فتادے فارسی اور عربی میں لکھے گئے، مجموعہ خانی امیر الغ تتلغ بہرام خاں کے لیے مولانا کمال الدین بن عبد الکریم ناگوری نے لکھی، خزانۃ الروایات قاضی جگن گجراتی نے تصنیف کی، مفتی ابو الفتح رکن الدین بن حسام الدین ناگوری نے فتاویٰ حمادیہ کے نام سے کتاب لکھی، قاضی ضیاء الدین عمر سنامی نے الفتاویٰ الضیائیہ کے نام سے

اپنے فتادے مرتب کیے اور قاضی نظام الدین گیلانی جونپوری نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی والی جونپور کے نام سے فتاویٰ ابراہیم شاہیہ لکھی جس کو چلپی نے کشف الظنون میں فتاویٰ قاضی خان کے مانند کتاب کبیر من افخر الکتب لکھا ہے اور یہ کہ مصنف نے ایک سو ساٹھ کتابوں سے اس کو جمع کیا ہے۔

ان کے علاوہ یہاں کے اصحاب فقہ و فتویٰ اور مشائخ نے بہت سی کتابیں فتاویٰ پر لکھیں، یہاں مثال کے طور پر چند کتابوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے، اس سلسلہ میں سب سے عظیم خدمت سلطان محمد اورنگزیب عالمگیرؒ متوفی ۱۱۱۸ھ نے انجام دی ہے، سلطان موصوف نے اوائل سلطنت میں مولانا نظام الدین برہان پوری کی زیر نگرانی ان چار حنفی علما و فقہا کو جمع کر کے فتاویٰ عالمگیری کو مرتب کرایا، قاضی محمد حسین جونپوری، شیخ حامد جونپوری، شیخ علی اکبر حسینی، اسعد اللہ خانی اور مفتی محمد اکرم لاہوری، نیز ان علما و فقہا کے تعاون کے لیے تقریباً بیس اہل علم مقرر کیے گئے، یہی فتاویٰ عالمگیری عرب ممالک اور عالم اسلام میں فتاویٰ ہندیہ کے نام سے مشہور و مقبول اور متداول ہے اور موجودہ دور میں اسلامی تحریکات و رجال کے نزدیک اسلامی قوانین کے سلسلہ میں فتاویٰ ہندیہ کی افادیت و اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

اردو زبان میں سب سے پہلے کس نے فتادے جمع کیے؟ اس کی تعیین نہیں ہو سکی، گذشتہ صدی تک فارسی زبان کا عام چلن تھا اور علما عام طور سے اسی زبان میں کتابیں لکھتے تھے، اردو میں مذہبی کتابیں لکھنے کا سلسلہ حضرت شاہ عبد القادر، حضرت شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن مجید اور حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید وغیرہ کی تصانیف سے شروع ہوا، اسی دور میں مولانا خرم علی بلہوری نے فقہ حنفی کی مشہور کتاب الدر المختار کا

اردو میں ترجمہ غایۃ الاوطار کے نام سے شروع کیا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا، نیز انھوں نے مشارق الانوار کا ترجمہ اور شرح اردو میں لکھی، نصیحۃ المسلمین انکی مشہور کتاب ہے۔

مگر ان حضرات سے بہت پہلے اردو میں بعض تصانیف ملتی ہیں، جو خالص فقہ و فتوی کے موضوع پر ہیں، راقم کے کتب خانہ میں فقہ المبین کے نام سے اردو میں منظوم ۴۶ صفحہ کا ایک رسالہ ہے، پہلا ورق غائب ہے اس لیے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا، یہ رسالہ ۲۳۴ سال پہلے ۱۱۸۲ھ میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ مصنف نے کتاب کے خاتمہ پر لکھا ہے:

یقیں فقہ المبیں کوں کرلی مختوم — بحق دین پناہ و آل معصوم
صد و ہشتاد و دو' والف ہجرت — بتاریخ مبارک گشت تمت
اگیارہ سو برس اسی اوپر دو — سنہ ہجری سین کی تھی جب بنا یو

کتاب کے عنوانات فارسی میں ہیں اور مسائل اردو نظم میں ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو:

در بیان فرائض غسل گوید

فرائض غسل کے سب تین ہیں مان — اگر باور نہیں تو دیکھ تبیان
اول لے موں میں پانی غرغرہ کر — پچھیں لے ناک میں پانی برادر
سویم پانی بہانا سب بدن پہ — فرائض غسل کے کردل میں از بر

مصنف نے اس کتاب میں اپنے زمانہ کی بدعات و خرافات کا نہایت شدت سے رد کیا ہے، فقہ المبین کو مقبولیت حاصل ہوئی اور لوگوں نے اس کو نقل کیا اور پڑھا، پیش نظر نسخہ ۱۵ شوال ۱۲۲۱ھ میں لکھا گیا ہے، عجب کیا ہے کہ یہ فقہ و فتوی میں اردو زبان میں پہلی کتاب ہو۔

سفرنامہ روم و مصر و شام

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

ترکوں کا روشن اور خوشنما پہلو ترکوں کی تصویر کے تاریک اور بدنما پہلو کو دکھانے کے بعد اب ہم اس کا تابناک اور روشن پہلو دکھائیں گے، اہل یورپ نے تاریک پہلوؤں ہی کو نمایاں کیا ہے، اس لیے مولانا نے بھی خوشنما اور اچھے پہلوؤں کو زیادہ دکھایا ہے، تاکہ یورپ نے ترکوں میں مین میخ نکال کر انہیں جن عیوب و قبائح سے متہم کیا ہے، اس کا خلافِ حقیقت ہونا پوری طرح ظاہر ہو جائے۔

صفائی اور خوش سلیقگی وہ ایک سول سروس کالج (مکتب ملکیہ) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کھانے کا کمرہ نہایت خوش سلیقگی سے مرتب تھا، میز پہ نہایت صاف چادر بچھی تھی اور کھانے کے پر تکلف برتن خوبصورتی سے چنے تھے، صراحیاں جو طالب علموں کی تعداد کے موافق تھیں عموماً شیشے کی تھیں اور گویا میز کی آرائش کا کام دیتی تھیں، کیمسٹری وغیرہ کی تعلیم کے کمرہ میں اعلیٰ درجہ کے آلات تھے اور کثرت سے تھے، اسی سلسلۂ عمارت میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے اس کی عمارت چنداں قابلِ ذکر نہیں، لیکن چونکہ اندر باہر نہایت اعلیٰ درجے کا ترکی قالین بچھا ہوا تھا خوبصورت اور مزین معلوم ہوتی تھی۔ اسی اثنا میں ظہر کا وقت آگیا۔ مسلمان لڑکوں نے نماز کی تیاری کی وہ

عموماً کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے اور اس لباس میں انکا ادب اور متانت کے ساتھ وضو کرنا اور وقار و احترام کے ساتھ قطار اندر قطار مسجد کو جانا مولانا کے دل پر عجیب اثر کرتا تھا (ص۴۶)

مولانا نے یہاں کے کالجوں میں یہ بات عموماً دیکھی جو ان کو بہت پسند آئی کہ منیجر معزز رتبہ کا آدمی ہوتا ہے اور اس کی طرز معاشرت سے عزت و شان ظاہر ہوتی ہے، مکتب ملکیہ کے منیجر صاحب کے کمرہ کو بھی حسب معمول مرتب اور آراستہ بتایا ہے (ایضاً ص۵۶)

ترکوں کی تہذیب و معاشرت کے اس طریقہ کو نہایت پسندیدہ اور قابل تقلید بتایا ہے کہ امرا اور معزز عہدہ دار ایک طرف معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس صفائی اور خوش سلیقگی سے بسر کرتا ہے، ہندوستان میں بڑے بڑے امیروں کو وہ بات نصیب نہیں، دس ہزار کے تنخواہ دار سے لیکر بیس روپے کی آمدنی والوں تک کے مکانات کی حالتوں میں گو تفاوت تھا، تاہم خوش سلیقگی اور ترتیب و صفائی میں ان کو برابر برابر بتایا ہے (ص۱۲۶)

ترکوں کی تہذیب و ترقی میں سب سے زیادہ قابل قدر اور قابل تقلید وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت اور طریقہ معاشرت کو بتاتے ہیں اور ان کے مقابلے میں یورپین اور ایشیاٹک دونوں بڑی قوموں کو افراط و تفریط کے انتہائی کناروں پر بتایا ہے وہ لکھتے ہیں:

"ترکوں نے ایسا معتدل طریقہ اختیار کیا ہے جو دونوں کی خوبیوں کا جامع اور دونوں کے عیوب سے خالی ہے، ٹرکش عورتیں تعلیم یافتہ ہیں لیکن بے شرمی، شوخی، بیجا آزادی، رقاصی کی (اور وہ بھی غیر مردوں کے ساتھ) ان کو تعلیم نہیں ہوئی ہے، وہ پردے کی پابند ہیں لیکن جاہل، دنیا سے بے خبر، مکان کے قفس میں بند، حیوان انسان نما نہیں

ہیں" (ص۱۳۰)

مولانا بورڈنگ سسٹم کو تعلیم و تربیت کے معاملے میں سب سے زیادہ قابل قدر قابل عزت بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ترکی سے بہتر کہیں کا طریقہ نہیں ہو سکتا، رقمطراز ہیں:

"تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہیں اور ان میں نہایت کثرت سے طلبہ رہتے ہیں لیکن یہ التزام ہے کہ خوراک، لباس، وضع، مکان، فرنیچر، تمام چیزیں ایک سی ہوں اور طالب علموں کی حالتوں میں فرق مراتب کا کوئی شائبہ نہ ہو، بورڈنگ کا کرایہ اور خوراک کی جو فیس لی جاتی ہے، اس کے ساتھ کپڑوں کے دام بھی لیے جاتے ہیں اور طالب علموں کے کپڑے خود کالج کے اہتمام سے تیار ہوتے ہیں، تمام لڑکے میز اور کرسیوں پر کھاتے ہیں اور ہر چیز میں تکلف، صفائی، خوش سلیقگی کا نہایت اہتمام کیا جاتا ہے" (ص۵۷)

مولانا کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ کے اختلاف مراتب پر بڑا افسوس تھا وہ یہاں کے تمام طلبہ کو ایک سطح پر دیکھنا چاہتے تھے، تاکہ کوئی شخص کسی طرح تمیز نہ کر سکے کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے۔ اس ضمن میں وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں:

"طالب علموں کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے اور غربا کو اعلا درجے کی معاشرت حاصل ہونا، ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری کا مادہ پیدا کرتا ہے" (ص۵۸)

وہ ترکی کالجوں اور اسکولوں کی اس مفید اور موثر جدت کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ ہر طالب علم کے کوٹ کے گریبان سنہری کلابتوں میں اس کالج یا اسکول کا نام کڑھا ہوا ہوتا ہے جس میں وہ تعلیم پاتا ہے، کلابتوں کے حرف ابھرے ہوئے اور اعلی درجے کے

خط نستعلیق کے مطابق ہوتے ہیں، چار بجے کے قریب اسکولوں اور کالجوں کی گزرگاہوں پر جایئے تو عجیب دلفریب سیر نظر آتی ہے، غول کے غول لڑکے مدرسوں سے نکل کر متعدد صفوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور اس ترتیب اور انتظام سے چلتے ہیں کہ گویا باقاعدہ فوج جارہی ہے، لڑکوں کا سُرخ و سپید رنگ، اس پر سیاہ کوٹ اور کوٹوں کے گریبان پر کالجوں کا زریں طغرا اس قدر خوشنما معلوم ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے (ص ۵۹)

مولانا نے اس طریقے کو زیب و زینت اور شان و شوکت کے علاوہ اس اعتبار سے بھی مفید بتایا ہے کہ طالب علم سیر و تماشے کی غرض سے بازار میں نکلتے ہیں تو کوئی نامناسب حرکت نہیں کر سکتے۔ کالج کا لباس جس کا ہر وقت پہننا لازمی ہے پہنوا دیتا ہے کہ وہ طالب علم ہیں اس لیے خواہ مخواہ ان کو کالج کے ناموس کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اس پر بھی اگر کوئی لڑکا کسی ناروا صحبت میں شریک یا کسی بیہودگی کا مرتکب ہو تو پولیس میں پکڑ کر اس کو اس کالج یا اسکول میں پہنچا آئے گا، جہاں وہ تعلیم پاتا ہے۔ (ص ۵۹)

بیروت کے بازار میں گئے تو انہیں سب سے زیادہ یہ بات پسند آئی کہ تمام دکاندار اور پیشے والے حتی کہ قلی اور مزدور بھی نہایت خوش وضع اور پاکیزہ لباس تھے، (ص ۲۱) سمرنا میں ایک نان بائی کی دکان پر گئے تو کہتے ہیں کہ نان بائی کے لفظ سے ہمارے ناظرین کو ہندوستان کے نان بائیوں اور ان کی ذلیل دکانوں کا خیال آیا ہوگا لیکن یہ قیاس صحیح نہیں، یہاں معمولی سے معمولی دکان کی آراستگی کی صورت یہ ہے کہ متعدد چھوٹی چھوٹی میزیں اور ان کے گرد کرسیاں لگی ہیں، میزوں پر نہایت صاف چادر بچھی ہوئی ہے، دیوار کے ایک کونے میں ٹونٹی لگی ہے اور اس کے نیچے طشت اور دائیں طرف صابون اور تولیہ رکھا ہے، یہ نہایت معمولی دکان کی کیفیت ہے اور

بڑی بڑی دکانیں جن کو ہوٹل کہا جا سکتا ہے نہایت پُر تکلف اور پُرشان ہیں لیکن اس قسم کے جس قدر ہوٹل ہیں عیسائیوں کے ہیں (ص ۴۵)

ترکوں کی فیاضی اور خوش اخلاقی

ترکوں کی فیاضی کا ذکر جا بجا کیا ہے، ایک جگہ ان کی اس عجیب قابل قدر فیاضی کا تذکرہ کیا ہے کہ باوجود فیس کی زیادتی کے غربا، کالجوں کے فیض سے محروم نہیں رہتے، ہر کالج میں غریب طالب علموں کی معتد بہ تعداد ہے اور دولتمند ترکوں کی طرف سے ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں، مکتب سلطانی جس کی فیس ۴۰ پونڈ سالانہ ہے اس میں ۲۰۰ طالب علم غریب اور کم مقدور ہیں، ان میں سے ڈیڑھ سو طالب علموں کی فیس امرا اور سلاطین حکومت ادا کرتے ہیں اور پچاس کی سلطان اپنی جیب خاص سے عطا کرتے ہیں (ص ۵۸)

مولانا کے سفر کا تمام زمانہ نہایت لطف، آرام، دلچسپی اور اطمینان سے بسر ہوا، یہ لطف و آرام انہیں کیونکر اور کن لوگوں کی وجہ سے میسر آیا، لکھتے ہیں:

"ان سوالوں کا صرف ایک جواب ہے یعنی ترکوں اور عربوں کے فیاضانہ اخلاق، حقیقت یہ ہے کہ اگر عربوں کی کریم الاخلاقی سے مجھ کو سابقہ نہ پڑتا تو سفر کی دلچسپیوں کا کیا ذکر ہے، زندگی دوبھر ہو جاتی، یہ ظاہر ہے کہ کسی شہر میں جاکر رہنا کھانا پینا، ملنا جلنا، خرید و فروخت، سیر و تماشا، حالات کی تحقیق و جستجو، دریافت طلب امور کی تلاش، غرض تمام باتیں زبان کے جاننے پر موقوف ہیں اور میں ترکی زبان سے بالکل ناواقف، عربی زبان جس قدر جانتا تھا وہ بھی بیکار یا قریب قریب بیکار تھی، اس قدر دولت مند بھی نہ تھا کہ بے دریغ روپیوں کے صرف سے اس کی تدارک کر سکتا، ایسی حالت میں چھ مہینے کا زمانہ اس لطف و آرام سے بسر کرنا کہ

گویا وہ وطن ہی میں تھا، صرف ترکوں اور خاص کر عربوں کی عنایت تھی، ترجمانی یہ کرتے تھے، قابل سیر مقامات میں رہبر یہ بنتے تھے، دل لگی کی صحبتوں میں شریک یہ ہوتے تھے، غرض کوئی ایسا کام اور ایسی ضرورت نہ تھی جس کے یہ کفیل نہ تھے اور لطف یہ کہ بے غرض بے سبب صرف مہمان پرستی اور غریب نوازی کے لحاظ سے تمام وہ جزئی واقعات جن میں مجھکو ان لوگوں کے فیاضانہ اخلاق کا تجربہ ہوا انکا بیان کرنا ناممکن ہے[1]۔

مولانا ترکوں کے اخلاق نہایت وسیع اور فیاضانہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غرور و نخوت ترفع اور کم بینی ان میں نام کو نہیں، امیر و غریب، مزدور و عہدہ دار، وضیع و شریف، جاہل و عالم سب سے ان کو سابقہ پڑا، لیکن خوش اخلاقی اور فیاض طبعی میں گویا سب ایک ہی مکتب کے شاگرد اور ایک ہی سانچے کے ڈھلے تھے، غازی عثمان پاشا جن کو پلونا کے واقعہ نے تمام دنیا میں روشناس کر دیا ہے اور درویش پاشا جن کا پوتا سلطان کی دامادی کا شرف رکھتا ہے، اس مرتبے کے لوگ ہیں جیسے ہندوستان میں گورنر جنرل یا کمانڈر انچیف، مولانا دونوں سے ملے تھے اور جس تواضع اور خوش اخلاقی سے یہ پیش آئے تھے اس کا اثر سفرنامہ لکھتے وقت بھی ان کے دل میں تھا[2]۔

وہ اسے ایک عام بات بتاتے ہیں کہ بازار میں چلتے چلتے جس شخص سے بھی گو وہ کسی رتبے کا آدمی ہو راستہ پوچھئے تو وہ نہایت مہربانی سے متوجہ ہوگا اور راستہ بتائے گا، بعض موقعوں پر ان کو نہایت تنگ اور پیچ دار گلیوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور راستہ بھول جانے کی وجہ سے دیر تک حیران رہے، اتفاقاً کوئی ترک آ نکلا تو اس نے راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہو لیا اور جہاں جانا ہوا وہاں تک پہنچا کر واپس آیا[3]۔

---

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۲۲۸ و ۲۲۹ [2] ایضاً ص ۱۲۳ و ۱۲۴ [3] ایضاً ص ۱۲۴۔

مولانا نے متعدد واقعات لکھ کر دکھایا ہے کہ ترک نہایت سیر چشم اور فیاض ہیں۔ فیاضی، خوش اخلاقی اور مہمان نوازی ترکوں کی عام صفت ہے[1] اور ان کے اخلاق نہایت عام ہیں اور اس کے لیے وسیلہ تعارف عزت و جاہ کی سفارش کی کچھ ضرورت نہیں[2]۔

ترکوں کا علمی شغف اور ان کے بعض علمی امتیازات

مولانا شبلیؒ نے ترکوں کے علمی شغف اور قدیم کتابوں کے ساتھ ان کے اعتنا کی تعریف کی ہے اور اس باب میں یورپ کی کوششوں سے بھی ان کے فائدہ اٹھانے کا ذکر کیا ہے، مثلاً ابن رشد نے ارسطو کی تصنیفات کا ایک نہایت مفید اور جامع خلاصہ لکھا تھا، یہ اصلی خلاصہ مفقود ہو گیا ہے لیکن لاطینی میں اس کا ترجمہ ہو گیا تھا جو اس وقت تک یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے، ایک ترکی عالم اسعد آفندی نے اس لاطینی خلاصہ کا عربی میں ترجمہ کیا اور جا بجا کچھ اضافے کیے جس کو مولانا نے راغب پاشا کے کتب خانہ میں ملاحظہ فرمایا تھا، ان کا بیان ہے کہ "یہ بہت بڑا مجموعہ ہے اور ترکوں کی علمی کوششوں کا عمدہ نمونہ ہے[3]"۔

مولانا شبلی اس امر کا انکشاف کرتے ہیں کہ دنیا کے جن حصوں پر اسلام نے حکومت کی، وہاں کی ملکی زبان اگر بالکل مٹ نہیں گئی تو اتنا ضرور ہوا کہ علمی حیثیت کا منصب اس سے چھن کر عربی زبان کو مل گیا، ہندوستان، فارس، اسپین اور افغانستان میں یہی ہوا، ترک کو بھی وہ اس عام اثر سے مستثنیٰ نہیں قرار دیتے تاہم وہ تمام اسلامی قوموں میں ترکوں کا یہ امتیاز و تفوق بتاتے ہیں کہ انہوں نے عربی زبان کی اطاعت کے ساتھ اپنی زبان کو بھی علمی خزانوں سے محروم نہیں ہونے دیا، جس زمانے میں علوم قدیمہ کی حکومت تھی، اس زمانے میں ترکی زبان میں ان علوم کا پورا سلسلہ موجود تھا اور اب بھی ہے، وہ

---

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۱۲۴ [2] ایضاً ص ۱۲۶ [3] ایضاً ص ۶۳۔

اس پر حیرت ظاہر کرتے ہیں کہ تاریخ ابن خلدون، طبری، ابن خلکان، مقریزی وغیرہ جو نہایت ضخیم کتابیں ہیں اور جن میں سے بعض بعض سات جلدوں میں ہیں، ترکی میں سب کا ترجمہ موجود ہے، بخلاف اس کے فارس و افغانستان میں اس کی ایک نظیر بھی نہیں مل سکتی ہے؎۱

مولانا اپنے ایک ترک دوست کے حوالے سے جو متعدد زبانوں کے ماہر تھے، بیان کرتے ہیں کہ فرنچ زبان کی تاریخیں، ڈرامے، ناول، سفرنامہ، کتب انشا و بلاغت اس کثرت سے ترکی میں ترجمہ ہوگئی ہیں کہ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ فرانس کا پورا علم ادب ترکی زبان میں آگیا ہے، اسی طرح علوم و فنون جدیدہ کی بھی سینکڑوں کتابیں ترجمہ ہوچکی ہیں اور ترکی کے تمام کالجوں بجز مکتب سلطانیہ کے ان علوم و فنون کی تعلیم ترکی ہی زبان میں ہوتی ہے اور اعلیٰ درجہ پر ہوتی ہے؎۲

مولانا شبلی کو اتنی فرصت اور اتنا موقع نہیں تھا کہ تمام جدید تصنیفات سے واقفیت حاصل کرتے تاہم اپنے مذاق کے موافق تاریخ و رجال کی کتابیں دیکھیں اور اس کی بنا پر یہ اظہار خیال فرماسکے کہ :

"عربی کے بعد ایشیا کی کسی زبان میں اس قدر تاریخی سرمایہ موجود نہیں ہے بلکہ ایک لحاظ سے اس کو عربی پر ترجیح حاصل ہے، عربی زبان میں جس قدر تاریخیں ہیں، سادہ واقعات کا مجموعہ ہیں اور جس قدر کوشش اور اہتمام ہے، صرف اصول روایت کے متعلق ہے بخلاف اس کے ترکی تاریخیں ان اصول و قواعد کے موافق لکھی جاتی ہیں، جو فلسفہ تاریخی کے اصول ہیں اور جس کی بنا پر یورپ نے اس فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے، مکتب ملکیہ میں تاریخ کی کتاب جو درس میں داخل ہے میں نے اس کو اجمالی طور پر دیکھا، تمام

؎۱ سفرنامہ روم و مصر و شام : ص ۸۰ ؎۲ ایضاً۔

واقعات میں علت و اسباب کا سلسلہ ملحوظ رکھا ہے اور جا بجا محاکمہ اور تحقیق و تنقید کی ہے، اس کے ساتھ ہر عہد حکومت کے خاتمہ پر اس عہد کی تمدنی، اخلاقی، علمی حالت تفصیل کے ساتھ دکھائی ہے"؎۳

ترکی میں علوم و فنون کی روزافزوں ترقی اور ہر فن میں کثرت سے نئی تصنیفات کی اشاعت کی بنا پر مولانا کا خیال تھا کہ "اس لحاظ سے تمام ایشیائی دنیا پر اس کو فضیلت کا رتبہ حاصل ہے"؎۴

کتب خانوں کو ترکوں کے علمی کارناموں میں سب سے زیادہ قابل فخر بتایا ہے، اسلامی دنیا کے جن حصوں میں آج تعلیم و تعلم کا چرچا ہے وہ ہندوستان، عرب، مصر، شام، بلاد مغرب، فارس و ایران ہیں، ان کے علمی سرمایہ کا براہ راست مشاہدہ کرنے اور ان سے یقینی واقفیت حاصل کرنے کی بنا پر مولانا کہتے ہیں کہ "تمام اسلامی دنیا میں قسطنطنیہ عربی تصنیفات کا سب سے بڑا مرکز ہے"؎۵ بیروت کی علمی ترقی اور مدارس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی وہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ "تمام ممالک اسلامیہ میں قسطنطنیہ کے سوا کوئی شہر اس کا ہم سر نہیں ہے اور بعض خصوصیتوں میں تو اس کو قسطنطنیہ پر بھی ترجیح حاصل ہے"؎۶

کتب خانے اگلے پاشاؤں اور امیروں نے قائم کیے ہیں اور سب کے سب وقف عام ہیں، ہر ایک پر اس قدر جائداد وقف ہے جس سے اس کے معمولی مصارف ادا ہوجاتے ہیں، مولانا اس ضمن میں ترکوں کی علمی فیاضی کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں :

"علمی فیاضی میں ترکوں کا رتبہ تمام اسلامی قوموں سے بالاتر ہے، ہندوستان میں مدتوں تک اسلامی حکومت رہی اور بڑے اوج و شان سے رہی، بڑے بڑے نامور وزرا و امرا

؎۳ سفرنامہ روم و مصر و شام : ص ۸۱ ؎۴ ایضاً ص ۸۰، ؎۵ ایضاً ص ۹۰ ؎۶ ایضاً ص ۱۲۹۔۔

گزرے لیکن آج ان کی ایک بھی علمی یادگار موجود نہیں۔[۱]

مولانا اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اور قوموں کے مقابلے میں ترکوں میں امرا کا گروہ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ تھا، کیونکہ اکثر کتب خانوں میں ان کی ذاتی تصنیفات یا ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں جو ان کے مذاق و وسعت نظر کی شاہد ہیں، اس کے علاوہ جس قسم کی عمدہ اور نایاب کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کی گئی ہیں خود ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جمع کرنے والوں کا علمی مذاق معمولی مذاق نہ تھا۔[۲]

مولانا شبلی ترکی اخبارات کو زیادہ قابل اعتنا نہیں بتاتے مگر میگزین اور ماہوار رسالے کو نہایت قدر کے قابل بتاتے ہیں، اسی ضمن میں مشہور و معروف ہفتہ وار معارف کے متعلق لکھا ہے:

"اس رسالے میں ہمیشہ اعلا درجہ کے مضامین لکھے جاتے ہیں اور ترکوں میں آج کل جو لوگ علوم جدیدہ کے مالک ہیں زیادہ تر اس رسالے کے ذریعہ سے اظہار کمال کرتے تھے، مضامین زیادہ تر نیچرل سائنس اور آلات جدیدہ کے متعلق ہوتے ہیں اور کوئی پرچہ تصویر سے خالی نہیں ہوتا۔"[۳]

اس کی تعداد اشاعت پانچ ہزار بتائی ہے، اس کے علاوہ جو رسالے مولانا کی نگاہ سے گزرے ان سب کے بارے میں لکھا ہے کہ کاغذ، خط، صفائی غرض ظاہری آب و تاب میں یورپ کے مشہور رسالوں کی ہم سری کرتے ہیں۔[۴]

بیروت کے علمی رسالوں کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ بڑی آب و تاب سے نکلتے ہیں اور خصوصاً الصفا اور المقتطف کو اس شان کے پرچے بتایا ہے جو یورپ کے میگزینوں کی

---

[۱] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۹۱ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۸۷ [۴] ایضاً۔

برابری کرتے ہیں[۱]

بیروت کے کالج (کلیہ سوریہ) کے اس معقول طریقہ کو قابل تقلید بتایا ہے کہ کالج کے جو ملازم اور پروفیسر وغیرہ اس میں سکونت رکھتے ہیں، ان کے کمروں کے صدر دروازہ پر ایک چھوٹی سی تختی لٹکتی رہتی ہے، اس پر جدا جدا سطروں میں صبح سے شام تک کے کاموں کی تفصیل لکھی ہوتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب خانہ کس وقت کہاں ہوتا ہے اور کیا کام کرتا ہے، مثلاً پہلی سطر میں لکھا ہے کہ لکچر روم، دوسری میں کھانے کا کمرہ، تیسری میں سیر و تفریح وعلی ھذا، تختی کی پیشانی پر ایک سوئی لٹکتی ہے، صاحب خانہ جس وقت جس کام میں مصروف ہوتا ہے سوئی کو اس سطر کے سامنے تختی پر اٹکا دیتا ہے جس میں کام اور کام کے موقع کا ذکر ہے، جو شخص ملاقات کو آتا ہے اول اس کی نگاہ تختی پر پڑتی ہے اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ صاحب خانہ اس وقت کہاں ہے اور کس کام میں ہے،

مولانا کہتے ہیں کہ ان کو معلوم نہیں کہ یہ طریقہ کالجوں کے ساتھ مخصوص ہے یا ہر طبقہ میں رائج ہے، بہر حال وہ اس عمدہ طریقہ کو اس قابل بتاتے ہیں کہ ہر جگہ اس کی تقلید کی جائے۔[۲]

اسی کالج کے ساتھ میڈیکل کالج بھی ہے، مولانا نے گو ہندوستان کا کوئی میڈیکل کالج نہیں دیکھا، لیکن ان کو کافی یقین ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک کالج بھی اس سے بڑھ کر بلکہ اس کے برابر بھی نہ ہوگا۔[۳]

مصر کے ایک مدرسہ تجہیزیہ کے بارے میں بتایا ہے کہ تمام لڑکے نہایت سلیقہ اور

---

[۱] سفرنامہ روم و مصر و شام، ص ۱۶۲ [۲] ایضاً ص ۱۵۷ [۳] ایضاً ص ۱۶۰۔

صفائی کے ساتھ رہتے ہیں، کھانے کا کمرہ نہایت وسیع اور خوشنما تھا اور دو تین میزیں اور کثرت سے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، کھانے کا طریقہ اگرچہ قسطنطنیہ اور شام کے موافق تھا یعنی چار چار شخصوں کے آگے ایک ایک پلیٹ تھی، چھری کانٹے بالکل نہ تھے، مولانا کو حیرت ہوتی تھی کہ لڑکے اس خوبی اور صفائی سے کھاتے تھے کہ ان کے ہاتھ مطلق نہیں بھرتے تھے، نہ میز کی چادر پر کہیں دھبا تھا، آپس میں بات چیت کرتے تھے لیکن شور و غل کا کیا ذکر ہے، گونج تک نہ تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ مدرسہ کے افسروں میں سے دو ایک ہمیشہ طالب علموں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں اور ہر ہفتہ میں کھانا کھانے کی تہذیب و شائستگی پر لکچر دیا جاتا ہے[1]۔

ترکوں کی سادہ اور سپاہیانہ زندگی

مولانا شبلی کو ترکوں کی معاشرت میں یہ چیز سب سے زیادہ پسند ہے کہ باوجود نفاست پسندی اور عالی دماغی کے فضول شان و شوکت کا نام نہیں، بڑے بڑے وزرا و امرا بازار میں نکلتے ہیں تو معمولی حیثیت سے نکلتے ہیں، انہوں نے بارہا وزیر اعظم کی سواری دیکھی ہے، صرف دو تین سوار ساتھ ہوتے تھے، سپہ سالار کل علی رضا پاشا کے ساتھ پانچ سوار سے زیادہ نہیں ہوتے مکانات اور تمام معاشرت کی چیزوں میں بھی سادگی پائی جاتی ہے، عثمان پاشا، درویش پاشا، زکی پاشا جس حیثیت اور رتبہ کے لوگ ہیں اس لحاظ سے ان کے مکانات کو کم از کم حیدرآباد کا فلک نما اور بشیر باغ ہونا چاہیے، لیکن مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"وہ ہمارے مولوی مہدی علی صاحب کی کوٹھی کے برابر بھی نہیں، نوکر چاکر بھی کثرت سے نہیں ہوتے جیسا ہمارے ہاں کے نواب اور فرضی شاہزادوں کے ہاں دستور ہے"

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۹۷۔

حق یہ ہے کہ ترک اس بات پر جہاں تک فخر کریں بجا ہے کہ انہوں نے چھ سو برس تک سلطنت کے سایہ میں پل کر سپاہیانہ پن نہیں چھوڑا، ورنہ عباسی، فاطمی، اموی (اندلس والے) تیموری تو سو ہی دو سو برس میں اچھے خاصے رنگیلے بن گئے تھے[1]"

ترکی حکومت کی بعض سختیوں اور پابندیوں کی توجیہ

مولانا کو دراصل ترکوں سے عشق تھا اور وہ ان کی اور مسلمان حکومتوں کی ہر ہر ادا پر فریفتہ تھے اس لیے کہیں کہیں ایک عام قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کی بے جا اور ناروا باتوں کی تاویل و توجیہ کر رہے ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی اکثر توجیہات نامناسب نہیں، ہم اس کی بعض مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ ترکی اخباروں کے آب و تاب سے نکلنے اور ان کی عبارت کے بہت سادہ اور شستہ ہونے کے معترف تھے، مگر ان کی پست حالت بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں تھی، چنانچہ اخباروں کی آزادی سلب کیے جانے کا انہوں نے بڑا ماتم کیا ہے اور اس ضمن میں جو اہم حقایق بیان کر گئے ہیں ان کو ایک دقیق النظر مبصر اور مفکر ہی بیان کر سکتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اخباروں کی اصل جان ان کی آزادی ہے جس کا وجود سرے سے نہیں، ان میں بجز سرکاری احکامات اور معمولی چیزوں کے اور کچھ نہیں ہوتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ترکی زبان پولٹیکل طرز تحریر یا در زور استدلال سے بالکل محروم ہے، ان کے نزدیک یہ حقیقت ہے کہ جس زبان میں آزادی کا عنصر نہ ہو اس میں رفعت خیال، قوت بیان، زور کلام، جوش تاثیر کیونکر اور کہاں سے آسکتا ہے، وہ عربی زبان کی مثال دیتے ہیں کہ

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۱۲۹ و ۱۳۰۔

جب تک خلافت راشدہ کا زمانہ تھا اور طبیعتیں آزاد اور خود سر تھیں، وہ جوش و تاثیر سے لبریز تھی لیکن جب شخصی حکومت کی بنیاد پڑی اور خاندان بنو امیہ نے بڑے زور اور قوت سے عرب کی آزادی کو پامال کر دیا تو زبان میں نہ تو وہ تاثیر رہی نہ وہ جوش رہا، گو مولانا کو یہ تسلیم ہے کہ زمانہ مابعد کا لٹریچر کثرت معلومات کی وجہ سے نہایت وسیع اور دولتمند ہے۔ مگر فرماتے ہیں:

"اس زمانہ کی تمام تصنیفات جہان مارد آزادانہ طرز تحریر اور پولٹیکل جوش اور تاثیر کا پتہ نہیں ملتا۔"[1]

اخباروں کی آزادی کے اس قدر حامی ہونے کے باوجود انہوں نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے اسے ترکی کے حالات کا فرری اقتضا بتایا ہے، لکھتے ہیں:

"رعایا کا اختلاف مذہب، سلطنت ہائے غیر کی رقابت، مخالفین کی دراندازیاں، اخباروں کا بات کو بتنگڑ بنانا، یورپین حکومتوں کی ہم سائیگی، یہ ایسے حالات ہیں جن میں آزاد سے آزاد گورنمنٹ بھی یہی کرتی جو ترکی نے کیا ہے، حال ہی میں فرانس کی جمہوری حکومت نے ٹونس[2] میں اخبارات کی آزادی سے متعلق جو احکام جاری کیے ان کو دیکھ کر کون نا انصاف ہے جو تنہا ترکی کو مورد الزام قرار دے سکتا ہے۔"[3]

لیکن کتابوں کی طباعت میں روک ٹوک کو کسی قدر قابل اعتراض مانتے ہیں، انہوں نے وہاں کا یہ عام قاعدہ بتایا ہے کہ چھپنے سے پہلے کتاب معارف کے سررشتہ میں پیش کی جاتی ہے، صیغۂ معائنہ و تفتیش کے عہدہ دار اسے اول سے آخر تک پڑھتے ہیں ان کی رپورٹ پر بعض اوقات کتاب کا چھاپنا روک دیا جاتا ہے یا اس میں حک و اصلاح کی جاتی ہے،

---

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۷۵۔ [2] ٹونس کو فرانس کے چنگل سے اب آزادی مل گئی ہے [3] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۸۵۔

اس قاعدہ کی وجہ بتائی ہے کہ بعض لوگ کتابوں کے چھاپنے میں نہایت بد دیانتی کرتے تھے، جس کی مثال یہ دی ہے:

"بیروت میں عیسائیوں نے الفاظ الکتابیہ جو چھاپی اس میں جہاں جہاں قرآن پاک کی آیتیں تھیں اور اسلامی طریقہ کے موافق کے عنوان کے طور پر قال اللہ یا کما فی القرآن المجید تھا، سب جگہ بدل کر قیل یا کما قال فی القرآن بنا دیا حالانکہ کسی مسلمان کے قلم سے قرآن مجید کی نسبت ایسے الفاظ نہیں نکل سکتے، اس سے زیادہ یہ کہ ان ہی عیسائیوں نے قرآن مجید کا ایک انتخاب چھاپا ہے اور جہاں جہاں کسی آیت میں عیسائی روایتوں کے خلاف کسی واقعہ کا ذکر ہے تو سین میں لکھ دیا ہے کہ "یہ غلط ہے اور صحیح یوں ہے"۔ بے شبہ ایک اسلامی سلطنت اس قسم کے تصرفات کا تحمل نہیں کر سکتی اور یہی سبب ہے کہ سلطنت کی طرف سے کتابوں کے شائع ہونے کے وقت نہایت احتیاط اور تفتیش سے کام لیا جاتا ہے۔"[1]

اہل نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ترکی کی طرف سے جو سخت اقدامات کیے گئے ہیں، مولانا شبلی نے ان کی جو توجیہ کی ہے وہ قطعاً غیر مناسب نہیں ہے، تاہم وہ اس سلسلہ کی بعض بے اعتدالیوں پر تنقید بھی کرتے ہیں جو انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"لیکن افسوس ہے کہ آج کل اس کا طریق عمل اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے، یہ صیغہ تحریف و تبدل کے روک کی غرض سے قائم ہوا تھا مگر بعض اوقات اس نے خود تحریف و تغییر پر عمل کیا ہے، ایک مطبع میں شرح عقائد النسفی چھپ رہی تھی معارف نے اس کتاب کی تمام وہ عبارت قلم زد کر دی تھی جس میں خلافت کی بحث ہے اور الائمۃ

---

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۸۵ و ۸۶۔

ھن فتوعیش کی حدیث مذکور ہے" مطبع والے نے مجبوراً اسی قلم زد نسخہ کو چھاپا ہے لیکن اصل نسخہ جس پر معارف نے یہ تصرف کیا تھا دیکھا اور مجھ کو یاد ہے کہ اس وقت میں رنج اور غصہ کی وجہ سے بے اختیار ہو گیا تھا، ان لوگوں نے یہ تصرف بخیال خود سلطان کی ہوا خواہی کے جوش میں کیا ہوگا لیکن اگر حضور ممدوح کو اس سے اطلاع ہوتی تو وہ ہرگز اس کو پسند نہ کرتے"[1]

مولانا ترکی اور اسلامی حکومت کی ہر ہر بات میں خیر و خوبی کے پہلو ڈھونڈ لیتے تھے یہاں تک کہ وہ مصر میں تھیٹر کی سیر اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اسلامی حکومت کی چیز ہے اور فرماتے ہیں :-

"تھیٹر ہندوستان کا ہو خواہ عرب اور مصر کا، میرے نزدیک اس کی شرکت وقار و شائستگی کے خلاف ہے لیکن اسلامی سلطنت کی ہر چیز عزیز معلوم ہوتی تھی۔

اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا"[2]

مولانا کو عیسائیوں کے تعصب، تنگ خیالی، اسلام اور مسلمانوں پر بیجا اعتراض و الزام کی شکایت تھی اور سخت شکایت تھی، ان کا خیال تھا کہ تعصب اور تنگ خیالی میں وہ دنیا کی عام قوموں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہیں، لیکن عیسائیوں میں جو باتیں اچھی ہوتی تھیں ان کی تعریف و ستایش بھی کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے علمی اندوختہ کو منظر عام پر لانے کی جو سعی بلیغ اور غیر معمولی جد و جہد کی ہے اس کے وہ نہایت مداح تھے مگر ان کا یہ خیال تھا کہ ان کی یہ خدمات بھی ان کے تعصب اور تنگ نظری سے خالی نہیں، فرماتے ہیں "البتہ یہ افسوس ہے کہ ان عیسائیوں کی تصنیفات میں مذہبی تعصب کا رنگ پایا جاتا ہے چنانچہ

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۸۶، ۸۷ [2] ایضاً ص ۲۲۰۔

صناجۃ الطرب اور اصول المعارف وغیرہ میں اس قسم کی بے اعتدالیاں صاف محسوس ہوتی ہیں"[1] پروفیسر آرنلڈ سے مولانا نے فرنچ سیکھی تھی وہ جہاز میں مولانا سے عربی پڑھتے تھے، اسپین کا ایک عیسائی جو جہاز میں ساتھ تھا، آرنلڈ کے عربی پڑھنے سے جلتا تھا، اکثر ان کے پاس آکر تحقیر کے ساتھ عربی حرفوں کو نہایت برے لہجے سے ادا کرتا اور کہتا کہ یہ زبان تو بدوؤں کی زبان ہے"[2]

عیسائیوں اور اہل یورپ کے بعض اعتراضات کا جواب

مولانا شبلی نے سفرنامہ میں جابجا عیسائیوں اور یورپین مصنفین کے الزام کا جواب بھی دیا ہے، ان کا یہ پامال اور پرانا الزام ہے کہ مسلمان ظالم و سفاک ہیں، انہوں نے جبر و تشدد اور ظلم و زیادتی سے اپنے مذہب کی اشاعت کی ہے، مولانا نے قسطنطنیہ کے عجائب خانے میں یہ ایک عجیب دردناک منظر دیکھا جس سے ان کا دل دیر تک متاثر رہا کہ ایک جداگانہ کمرے میں چند عورتیں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہیں، ایک شکنجہ میں دابی جا رہی ہے، ایک کی پیٹھ پر جلتے ہوئے لوہے کی پٹری رکھی ہے کہ گردن سے لے کر کمر تک چار چار انگل کھال اتر گئی ہے، اسی طرح اوروں کو عجیب عجیب طریقے سے اذیت دی جا رہی ہے، یہ عورتیں صورت اور وضع و لباس سے دولتمند اور شریف معلوم ہوتی ہیں، اکثر کم سن اور خوبصورت و نازک اندام ہیں، مولانا کو سخت تعجب ہوتا تھا کہ کن ظالم ہاتھوں نے ان حسن کی دیبیوں پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی ہوگی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ اسپین میں جب اسلامی حکومت برباد ہو کر عیسائیوں کی سلطنت قائم ہوئی تو عموماً مسلمان تبدیل مذہب پر مجبور ہو گئے اور چونکہ اسلام کا اثر آسانی سے دلوں سے مٹ نہ سکتا تھا ان کو انواع اقسام کی اذیتیں دی جاتی تھیں اور بے کسی اور

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۱۵۲ [2] ایضاً ص ۱۲۔

کمزوری کے لحاظ سے عورتوں پر زیادہ ظلم کیا جاتا تھا، یہ مظلوم عورتیں اسی عبرت انگیز واقعہ کی یادگار ہیں، اس وقت مولانا کو خیال ہوا کہ:

"آہا، یہی عیسائی ہیں جو ہم کو طعنہ دیتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا"[1]

عیسائی مسلمانوں کو قدامت پسندی، رجعت پرستی اور مذہبی جنون سے بھی متہم کرتے ہیں اور اپنے کو بڑا معقولیت پسند قرار دیتے ہیں، لیکن مولانا نے خود متقشف عیسائیوں کی یہی خصوصیت بتائی ہے، وہ جب ان کے مقدس گرجا قمامہ میں داخل ہوئے جس کے بارے میں ان کا اعتقاد ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یہیں مصلوب و مدفون ہوئے اور یہیں سے آسمان پر گئے، تو یہاں بڑے بڑے راہب و قسیس کو نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت میں مصروف دیکھا، جس مقام سے حضرت عیسیٰؑ آسمان پر گئے یہ ایک مختصر سا حجرہ ہے، صدر کی جانب چبوترے پر حضرت عیسیٰؑ کی مورت ہے، تمام بدن بجز ستر عورت کے برہنہ ہے، صورت سے کسی قسم کے تقدس اور شان نبوت کا اظہار نہیں ہوتا تھا، اس وقت شمع روشن تھی اور ایک بڑا مشتین پادری تصویر کی طرف ٹکٹکی باندھے مراقبہ میں مصروف تھا، اس سے فارغ ہوا تو مجاور نے اس کے سر پر تھوڑا سا پانی چھڑکا جس کو اس نے بڑے ادب سے چہرہ اور داڑھی پر مل لیا، صلیب دیے جانے کی جگہ شان و شوکت کی تھی لیکن اس کو دیکھ کر عیسائیوں کی سادہ لوحی پر مولانا کو سخت افسوس ہوا، وہ ان کی اسی طرح کی بعض اور رسوم کی تفصیل بیان کر کے لکھتے ہیں:

"مذہبی خیالات بھی کیا ہی عجیب چیز ہیں" (ص ۱۷۵)

مولانا سے زیادہ حکمت افرنگ کو کون سمجھ سکتا ہے، قبرص عرصہ دراز تک مسلمانوں کے

[1] سفرنامہ روم و مصر و شام: ص ۱۰۸۔

زیر نگیں رہا، پھر ان کے ہاتھ سے نکل گیا، ۱۵۷۰ء میں ترکوں نے اسے عیسائیوں سے واپس لیا، روم و روس کی اخیر جنگ میں انگریزوں نے اسے اس شرط پر لیا کہ سالانہ خراج جو سلطان کو ملتا تھا اب بھی ملتا رہے گا، گو انگریزوں نے مسلمانوں کے عام مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کی لیکن اندر اندر اپنا کام کرنے لگے، اس طرح اب وہ انھی کے زیر انتظام آگیا تھا، مولانا کو اپنے سفر میں اس کے شہر لماسول جانے اور وہاں کے ایک مکتب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہاں کے نو دس برس کے ایک طالب علم سے انھوں نے سوال کیا کہ تمھارا بادشاہ کون ہے؟ اس نے سلطان کو بتایا، مولانا نے کہا یہاں تو انگریز حکومت کر رہے ہیں، وہ بولا کہ ہاں متاجری کے طور پر لیا ہے اور سالانہ خراج ادا کرتے ہیں، اس پر مولانا انگریزوں کی اس دانشمندی اور حکمت عملی کا ذکر کرتے ہیں:

"کسی ملک پر قبضہ کرتے ہیں تو اس تدریج اور آہستگی سے کہ ملک والوں کو انقلاب حکومت کی خبر بھی نہیں ہوتی" (ص ۳۵)

ان سب کے باوجود مولانا کو اگر عیسائیوں میں بے تعصبی، انصاف پسندی یا کوئی اور خوبی نظر آتی ہے تو اس کا فراخدلی سے اعتراف کرتے ہیں، عربی زبان اور مسلمانوں کی مذہبی کتب کی اشاعت جو عیسائیوں کی بدولت ہو رہی تھی، اس کے اعتراف میں بخل نہیں کرتے، پورٹ سعید کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ بیت المقدس کے حج کا زمانہ تھا اس لیے فرسٹ اور سکنڈ کلاس عیسائیوں سے بھرے ہوئے تھے، آرنلڈ صاحب کو خیال ہوا کہ اس سے مولانا کو تکلیف ہوگی کیونکہ یہ لوگ مذہب کے سخت پابند ہیں اس لیے ضرور ہے کہ ان میں تعصب ہو، مولانا کو تجربے سے معلوم ہوا کہ ان کا خیال صحیح نہ تھا، لکھتے ہیں:

"وہ لوگ، پابند مذہب تھے لیکن فرنچ اور اٹالین تھے، انگریز نہ تھے اس لیے کم آمیزی اور

فاتح و مفتوح کا امتیاز جو فاتح قوم کی مخصوص صفتیں ہیں ان میں بالکل نہ تھیں۔ (ص ۱۹)

اسی طرح قسطنطنیہ کی اس عورت کے نیک مزاج ہونے کی تعریف کرتے ہیں جسکا مکان کرایہ پر لیا تھا۔

"اگرچہ اس کا مذہب عیسائی تھا اور قوم کی اٹالین تھی تاہم بقدر ضرورت عربی بول لیتی تھی اور مسلمانوں سے ایک خاص انس رکھتی تھی" (ص ۴۴)

مسٹر آرنلڈ کی جابجا توصیف کی ہے سفر میں جب جہاز عدن سے آگے بڑھا تو دوسرے دن یہ پُرخطر واقعہ پیش آیا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا جس سے مولانا اور دوسرے مسافر پریشان ہوئے کپتان اور جہاز کے ملازم بھی گھبرائے ہوئے تھے لیکن مسٹر آرنلڈ اطمینان سے کتاب پڑھ رہے تھے، مولانا نے کہا آپ کو کچھ خبر بھی ہے، انہوں نے کہا ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے مولانا نے کہا آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ کتاب دیکھنے کا یہ موقع ہے، فرمایا کہ اگر جہاز کو برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابل قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے، مولانا کو بھی ان کے استقلال اور جرأت سے اطمینان ہوا۔ (ص ۱۶)

قسطنطنیہ میں غلطہ کی شاندار آراستہ دکانیں اور ہموار، وسیع، کیچڑ اور نجاست سے پاک سڑکیں دیکھتے ہیں تو اسے یورپ کا ایک ٹکڑا بتاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یورپین سوداگر خود اپنی خواہش سے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں، اس لیے میونسپلٹی ان رقموں کو فیاضی سے صرف کرتی ہے اور صفائی اور پاکیزگی کا اہتمام کرتی ہے، وہ لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ صفائی اور خوش سلیقگی یورپ کا خمیر بن گیا ہے"۔ (ص ۴۵)

عیسائیوں کے ایک کالج کے نصاب میں قرآن مجید کا انتخاب شامل تھا اسکو اسلیے عجیب بتایا کہ مدرسے کے بانیان عموماً عیسائی تھے اور وہ بھی رومن کیتھولک عیسائی جن میں بہ نسبت اور قوموں کے تعصب زیادہ ہوتا ہے لیکن ادب کے نصاب میں قرآن مجید کے انتخاب کا شامل ہونا اسکا ثبوت ہے کہ قرآن مجید کا فصاحت و بلاغت میں بے مثل ہونا ان کو بھی مسلم ہے۔ (ص ۱۵۹)

شہر بریلی کے تاریخی کتبات

از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیبؔ بریلی

(۲)

ضریح آصفی امام باڑا نوابین اودھ کے بریلی پر ۲۷ سال کے عہد حکومت میں (۱۷۷۴ تا ۱۸۰۱ عیسوی) بریلی میں سلسلہ تعمیر عمارات جاری رہا۔ آصفی امام باڑا۔ آصفی مسجد حسینی باغ سنکھا ندی کا پل بشرقی بھگل ندی کا پل وغیرہ اس عہد کے یادگار نمونے ہیں لیکن ہر عمارت پر کتبے نہیں ملتے۔ آصف الدولہ کے عہد حکومت میں (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) آصفی امام باڑا المعروف بہ کالا امام باڑا۔ چھیپی ٹولہ بریلی) میں ضریح رکھی گئی تھی جس کی سنہری چادر پہ مندرجۂ ذیل منظوم فارسی قطعہ بہ خط نستعلیق کندہ کیا گیا ہے:

کرد ایں ضریح نذر حسین شہ دیں حسین علی	راضی از او نبیرۂ خیبر خیر الامام شد
میخواستم تعین تاریخ او کنم	از فضل حق بہ ساختنش انصرام شد
بے ردی اشتباہ خرد گفت در جواب	اے شکر کایں نیاز قبول امام شد
	۱۲۰۳

یہ کتبہ خطاطی وکندہ کاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ۱۲۰۴ ہجری مطابق ۹۰-۱۷۸۹ عیسوی۔ اس وقت بریلی کا ناظم سعید اللہ خاں اور فوجدار و تحصیلدار بشارت علی خاں تھا۔ یہ کتبہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ خود امام باڑا میں کوئی کتبہ نہیں ہے، لیکن کتبۂ ضریح امام باڑا کی تاریخی حیثیت کی تصدیق کرتا ہے یعنی امام باڑا ضریح رکھنے سے پہلے تعمیر ہوا تھا۔

مسجد آصفی | المعروف بہ شیعہ مسجد۔ یہ ایک عالی شان مسجد ہے۔ یہ بازار ساہوکارہ قلعہ روڈ کے کنارے واقع ہے۔ اس مسجد کو کافی اونچی کرسی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس مسجد میں یہ انفرادیت نظر آئی کہ اس کے فی ساد میں راہداری کی محراب کی نچلی سطح کو رنگوں سے منقش کیا گیا ہے۔ کمرۂ نماز کی جنوبی و شمالی دیواروں کے خلا میں خمدار محرابوں (CORNIC-ES) کو برائے زینت مہیا کیا گیا ہے۔ مسجد نو محلہ اور مسجد بی جی کے میناروں کی طرح اس مسجد کے میناروں کے استر پر منکسر دھاریاں (WAVY VOLUTION) ابھاری گئی ہیں۔ کمرۂ نماز میں تزئین کاری کا سلیقہ ملتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مسجد اودھ طرز تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس مسجد میں فی ساد پر جو منظوم فارسی کتبہ بہ خط نستعلیق لگا ہوا ہے، وہ اس طور پر ہے:

مسجد آصف ذیشان سنہ آں | عاشر و واحد والف و مأتاں
تاریخ وصال و دمی ثانوی بنائے | گفتہ سروش غیبی بخانہ خدائے
(۱۲۷۳)

اس کتبے میں پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی سے ۱۲۱۱ ہجری / ۱۷۹۶-۱۷۹۷ عیسوی اور دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں "بخانہ خدائے" سے ۱۲۷۳ ہجری / ۱۸۵۶-۱۸۵۷ء کے اعداد دستیاب ہوتے ہیں۔ شعر اول کے مطابق تعمیر مسجد نواب آصف الدولہ سے نسبت رکھتی ہے اور دوسرے شعر سے اس کی تعمیر ثانوی کا علم ہوتا ہے۔ آصف الدولہ کی وفات ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء کو ہوئی تھی۔ لہذا یہ مسجد از روئے کتبہ آصف الدولہ کے عہد حکومت میں ہی تعمیر ہوئی۔ اس وقت بریلی کا ناظم الماس علی خاں تھا۔ تعمیر ثانوی کس نے کرائی اور تعمیر ثانوی کے وقت مسجد میں کیا اضافے ہوئے ہنوز تحقیق طلب امور ہیں۔

آصف الدولہ نے بریلی کے قدیم منادر کی معافیات کو بحال کیا تھا اور اس نے نئی معافیات بھی جاری کی تھیں، جن کے فرامین محفوظ ہیں لیکن خود ان مندروں میں کوئی قدیم کتبہ نہیں ملتا۔ تلسی استھل (لب دیوڑنیاں ندی بریلی) پر دور اکبری کا خط نستعلیق میں ۱۵۸۶ء کا ایک کتبہ تھا وہ بھی اب نہیں ملتا۔

مقبرہ شاہ نیاز احمد بریلوی | یہ مقبرہ محلہ خواجہ قطب بریلی میں واقع ہے۔ یہ بریلی میں واحد سنگ مرمر کا مقبرہ ہے۔ عمارت میں حسن تناسب اور نزاکت کا جمال ہے۔ مغل طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کی تاریخ تعمیر کے سلسلے میں کوئی کتبہ موجود نہیں ہے۔ حضرت شاہ نیاز احمد کی قبر کے سرہانے ایک وصلی پر مندرجہ ذیل کتبہ ملتا ہے جو فن خطاطی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

مزار حضرت شاہ نیاز احمد صاحب۔ محلہ خواجہ قطب بریلی

تاریخ وصال حضور قبلہ

إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

۱۲۵۰ ہجری مطابق ۱۸۳۴ عیسوی۔ اردو عبارت بہ خط نستعلیق۔ عربی عبارت بہ خط نسخ۔ چونکہ حضرت شاہ نیاز احمد جلیل القدر صوفی تھے، یہ تاریخ وفات بہت برمحل ہے۔ مقبرے کے جانب جنوب خانقاہ نیازیہ ہے جس کی تاریخ تعمیر کا کتبہ ایک آہنی چادر پر خط نستعلیق میں ابھرے ہوئے حروف جڑ کر تیار کیا گیا ہے۔ یقیناً یہ بھی اعلیٰ کاریگری کا نمونہ ہے۔ کتبہ مندرجۂ ذیل ہے:

خانقاہ حضرت شاہ نیاز احمد۔ محلہ خواجہ قطب بریلی

قصر عالی خانقاہ نیازیہ

۱۳۴۱ھ

۱۳۴۱ ہجری مطابق ۱۹۲۲-۱۹۲۳ عیسوی۔

پل دیوریناں ندی | ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنہ۱۸۰۱ عیسوی میں بریلی پر قبضہ کیا تھا اور ۱۸۵۷ء تک اس کا اقتدار قائم رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس مدت میں بریلی میں فوجی چھاؤنی قائم کی۔ فوجی چھاؤنی میں گرجے، قبرستان (CEMETRY) باغ، صدر بازار، قلعہ، دفاتر اور بنگلے تعمیر کرائے۔ انگریزوں نے یہ تعمیرات اپنی سرکاری ضرورت اور اپنی آسائش کے لیے کرائی تھیں۔ سرکار کمپنی نے عوامی بہبود کا کوئی کام نہیں کیا۔ کمپنی نے گاتھک (GOTHIC) طرز تعمیر کو متعارف کرایا، جس کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے۔ کمپنی نے کتبات بھی انگریزی زبان میں لگائے۔ بریلی کے مغرب میں ڈیوریناں ندی پر پل کی ضرورت تھی جس کو بریلی کے ایک زمیندار دیوان بہادر سنگھ بھٹناگر اکبرآبادی[۱] نے تعمیر کرایا جو آج بھی استعمال میں ہے۔ اس وقت یہ پل بریلی کارپوریشن کے اندر ہے اور اس پر آمد ورفت بھی بے اندازہ ہے۔ پل کی جنوبی دیوار (PARAPET) کے مشرقی کونے پر ناگری اور نستعلیق میں مندرجہ ذیل کتبہ لگا ہوا ہے:

दिवान बहादुर
सिंह
دیوان بہادر سنگھ
۱۹۲۳ء

اُس عہد میں فارسی و اردو کا رواج تھا۔ اس کتبے میں ناگری کی امتیازی موجودگی ہندی کے احیاء کے لیے جد کی نشاندہی کرتی ہے۔ شاید انیسویں صدی عیسوی کا بریلی میں یہ واحد کتبہ ہے جو ناگری اور نستعلیق میں ہے۔

کمپنی باغ | یہ باغ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد اقتدار کی یادگار ہے۔ اس کا موجودہ نام گاندھی اُدیان (गांधी उद्यान) ہے۔ یہ باغ بریلی کینٹ کے متصل ہے۔ اس باغ کے

اندرونی دروازے پر دو کتبات لگے ہوئے ہیں۔ ایک کتبہ نستعلیق میں اور دوسرا ناگری میں۔ دروازے کے ستون ان کے مابین قوسی محراب، محراب میں ابھرے ہوئے چابی کے پتھر (KEY STONES)، محراب پر پلاسترا ور حاشیہ جس سے اینٹوں کے مابین لکیریں (VOU-SSOIRS) چھپ گئیں اور محراب کے اوپر مثلث نما ڈھانچہ (TRIANGULAR ST-RUCTURE) گاتھک طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔ اردو زبان میں کتبہ دروازے کے داہنے بازو کی محراب کے اوپر وسط میں ہے مستطیل سنگ مرمر پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ کی گئی ہے:

دروازہ بنایا رام لیکھ راج
رئیس بریلی۔ ۱۸۵۴ء

دروازے کے بائیں بازو پر یہی کتبہ ناگری میں لگا ہوا ہے۔ رام لیکھ راج رئیس بریلی کے حالات دستیاب نہیں ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکار کمپنی نے یہ باغ اپنے استعمال کے لیے بنوایا تھا، شاید اس کی حد بندی بھی کردی تھی، بعد کو رام لیکھ راج نے اسکا اندرونی دروازہ تعمیر کرایا۔ رام لیکھ راج ٹھیکیدار تعمیرات بھی ہو سکتا ہے۔

قبر نواب حافظ یار محمد خاں | نواب یار محمد خاں ابن محمد یار خاں ابن نواب حافظ رحمت خاں[۱] ان کی قبر محلہ باقر گنج بریلی میں مقبرہ حافظ رحمت خاں کی مسجد کی شمالی دیوار کے متصل ہے۔ نشان قبر پر کلمہ طیبہ کا طغریٰ (MONOGRAM) اور قبر کے سرہانے فارسی قطعہ تاریخ بہ خط نستعلیق نہایت خستہ حالت میں لگا ہوا ہے۔ کتبہ مندرجہ ذیل ہے:

تاریخ وفات یار محمد خاں

حیف از مرگ رئیس اعظم	قبر آباد و مکاں ویراں است
پدرش خان محمد یار است	جدا و حافظ رحمت خاں است

کراہد میں واقعہ دل بریاں است ………… گفت چوں رفت

لحد یار محمد خاں است
۱۲۶۷ھ

عجب بے ربط قطعہ ہے۔ قطعہ کے مصرعوں کی تعداد بھی طاق ہے۔ آخری مصرعہ سے ۱۲۵۰ کے اعداد نکلتے ہیں۔ بہر نوع اس کتبے سے نواب حافظ یار محمد خاں کی تاریخ وفات ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰۔۱۸۵۱ء اور جائے دفن کا علم ہو جاتا ہے۔

نواب حافظ یار محمد خاں کی قبر کے دونوں جانب سلسلۂ قبور ہے۔ کسی قبر پر کتبہ ہے اور کسی قبر پر کتبہ نہیں ہے۔ کوئی کتبہ اس حد تک ضایع ہو چکا ہے کہ اس کو پڑھا نہیں جا سکا۔ تاہم ایک بات واضح ہے۔ یہ سلسلۂ قبور نواب حافظ رحمت کے فرزند نواب محمد یار خاں کے اخلاف کا ہے۔ ذیل میں ان قبور کے کتبات کو متعارف کرایا گیا ہے۔

قبر نواب عبدالعزیز خاں عزیز | عبدالعزیز خاں عزیز ابن سعادت یار خاں ابن حافظ محمد یار خاں ابن نواب حافظ رحمت خاں۔ آں موصوف بریلی کے مشہور شاعر فارسی واردو مربی سخن اور متعدد کتب کے مولف تھے[۵۵]۔ ان کی قبر کے سرہانے مندرجہ ذیل کتبہ لگا ہوا ہے:-

مزار جناب عبدالعزیز خاں عزیز

کہ یکتائی زماں حافظ قرآں ہمہ داں جواد جہان فخر دوراں

نبیرۂ نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں بود۔ در ۱۲۵۱ سنہ بظہور

آمدہ حیات مستعار بعزت نیکنامی بسر بردہ در ۱۳۰۹ سنہ رحلت نمود

از دست

آندم کہ گلستاں ہدف جور خزاں بود	بر شہد گل مرغ چمن مرثیہ خواں بود
ابر آید و بر تربت من گرید و گوید	ایں گور عزیز است کہ از بادہ کشاں بود

مولوی قاسم علی خواہاں بریلوی (م ۱۹۳۸ء) نے عبدالعزیز خاں عزیز کی غزل کے مقطع سے تاریخ وفات نکالی ہے[۵۶]۔ "گوید" کے ۴۰ اور مصرعۂ آخر کے ۱۲۶۹ جمع کرنے سے ۱۳۰۹ کے اعداد شمار میں آتے ہیں[۵۷]۔ ۱۳۰۹ ہجری مطابق ۱۸۹۱ عیسوی۔ یہ کتبہ بھی خستہ ہو چکا ہے۔

قبر نیاز احمد خاں ہوش | نیاز احمد خاں ابن نیاز محمد خاں ابن یار محمد خاں ابن حافظ محمد یار خاں ابن نواب حافظ رحمت خاں۔ نیاز احمد خاں المتخلص بہ ہوش بریلی کے مشہور شاعر مورخ اور طبیب تھے۔ ان کو قصیدہ نگاری میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ خاندان روہیلہ کے بے حد ہر دلعزیز فرد اور مربی سخن تھے۔ ان کے تلامذہ بھی کثرت سے تھے[۵۸]۔ ان کی قبر کے سرہانے مندرجۂ ذیل کتبہ ملتا ہے:

آرامگاہ طبیب زمن نواب نیاز احمد خاں ہوش اعلی اللہ مقامہ

سنہ ۱۸۹۲ء

اٹھ گیا فخر خانداں کیا	صدمہ جاوداں ہے دنیا کو
نام نامی نیاز احمد خاں	ہر زباں بر زباں ہے دنیا کو
دفن زیر زمیں ہوا نواب	غم تہ آسماں ہے دنیا کو
آہ حکیم و مورخ و شاعر	جو ہر اس کا عیاں ہے دنیا کو
لکھ یہ تاریخ فوت خواہاں	غم بے عیاں ہے دنیا کو ۱۳۰۹ھ

تاریخ فوتی ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء۔

قطعہ تاریخ مولوی قاسم علی خواہاں بریلوی نے تحریر کیا۔ خط نستعلیق۔ بنے میاں حکیم نیاز احمد خاں کی عرفیت ہے۔

قبر نواب عبدالرشید خاں | عبدالرشید خاں نواب عبدالعزیز خاں عزیز کے پسر تھے۔ بہت

ذی علم اور ادب پرور رئیس تھے۔ ان کی قبر کے سرہانے مندرجہ ذیل کتبہ ملتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرقد نواب عبدالرشید خاں عرف پیارے میاں ابن نواب عبدالعزیز خاں صاحب عزیز مرحوم کہ در ۱۲۶۳ھ تولد شدہ و بتاریخ ۲۶ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۱ ستمبر ۱۹۲۸ء رحلت نمود

از دست

و اللہ وجہی فی النقاب	کما شمس الضحی بین السحاب
علی قبری مسیح جاء یوما	وقال قم الرشد من التراب
سرور خاندان حافظ الملک	اندریں جا ہمیں نماید خواب
گفت سال وفات او خواہاں	ہائے عبدالرشید خاں نواب
	۱۳۴۷

عربی اشعار نسخ میں اور فارسی اشعار نستعلیق میں۔ قطعہ تاریخ مولوی قاسم علی خواہاں بریلوی نے تحریر کیا۔ عربی اشعار نواب عبدالرشید خاں کا نتیجہ فکر معلوم ہوتے ہیں جن کو خواہاں نے اپنے قطعہ تاریخ میں شامل کیا۔

مکان بدرالدین کوتوال | بدرالدین ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا بریلی میں شہر کوتوال تھا۔ وہ انگریزوں کا وفادار تھا۔ جب انگریزوں نے ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بریلی سے بھاگ کر نینی تال میں پناہ لی اس وقت بدرالدین بھی ان کے ساتھ نینی تال میں مقیم ہوا تھا اس کے مکان واقع محلہ پنجابیان نالا بریلی کے دروازے کی محراب کے نیچے ایک حجری کتبہ لگا ہوا ہے جس پر دو اشعار کندہ کیے گئے ہیں جو پڑھنے میں نہیں آسکے۔ صرف بسم اللہ اور ۱۲۹۰ھ کو پڑھا جا سکا۔ ۱۲۹۰ ہجری مطابق ۱۸۷۳ عیسوی۔ کتبے سے بدرالدین کوتوال کے مکان اور اس کی سال تعمیر کا علم ہو جاتا ہے۔

مسجد برکات احمد | آں موصوف شیوخ بدایوں میں سے تھے۔ وہ کچہری بریلی میں ملازم تھے جس کی وجہ سے وہ بریلی میں مقیم ہوئے۔ ان کا عہد انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کو محیط ہے۔ ان کے نام سے محلہ ذخیرہ بریلی میں پھاٹک برکات احمد منسوب و مشہور ہے۔ ان کے زمانے میں یہ پھاٹک مسجد کی راہداری پر تھا لیکن بعد کو جب متعلقہ جائداد مفتیان بریلی کے قبضے میں تصرف میں آئی، مسجد کا نیا باب تعمیر کیا گیا اور پھاٹک ختم ہو گیا۔ مسجد برکات احمد کے نئے دروازے کی اندرونی محراب کے نیچے مندرجہ ذیل کتبہ لگا ہوا ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب مسجد بنا نہایت خوب	شکر خلاق دو سرا کا ہے
سال تعمیر کہہ دو قم احمد	باب یہ خانہ خدا کا ہے
	۱۳۱۹ ہجری

۱۳۱۹ ہجری مطابق ۱۹۰۱ - ۱۹۰۲ عیسوی۔ قطعہ نگار سید احمد شاہ احمد بریلوی جو محلہ ذخیرہ کا ساکن اور بریلی کا مشہور خوش نویس تھا۔ خط نستعلیق۔ کتبہ منجلی نہیں ہے اور وہ بدقت پڑھا جا سکا۔ آثار کتبہ بتاتے ہیں کہ وہ خوش نویسی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔

مکان نجیبن | نجیبن کا مکان واما باڑا گلی آریہ سماج۔ کتب خانہ بریلی میں واقع ہے جس کی تعمیر اس کے ماموں زاد بھائی اور مختار عام کلب حسین ماہر بریلوی (م ۱۹۱۱ء) نے کرائی تھی۔ اس مکان کے بلند دروازے کی صدر محراب کے اوپر خط نستعلیق میں مندرجہ ذیل کتبہ لگا ہوا ہے :

۷۸۶

منظر حسین

۱۳۱۸ھ

۱۳۱۸ ہجری مطابق ۱۹۰۰ - ۱۹۰۱ عیسوی۔ کتبہ پر شیشے کا فریم چڑھا کر اس کو محفوظ

کیا گیا ہے۔ یہ اہتمام کسی دوسری عمارت کے کتبہ پر دیکھنے میں نہیں آیا۔ کتبہ اتنا پرانا اور بلندی پر ہونے کے باوجود صاف پڑھنے میں آتا ہے۔

قبر سید قاسم علی خواہاںؔ بریلوی

سید قاسم علی خواہاںؔ بریلوی استاذ سخن، مربی سخن اور اپنی ذات میں ایک ادبی انجمن تھے۔ انہوں نے اپنی طویل عمر (۱۸۴۶ تا ۱۹۳۸ء) میں بکثرت قطعات تاریخ تحریر کیے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے ایک شاگرد نے ایک خوبصورت کتبہ لگا کر ان کے وقار سخن اور ان کی یاد کو قائم رکھا۔ ان کی قبر مسجد مولویان محلہ ذخیرہ نزد چاہ خرم میں ہے۔ یہ قبر مسجد کے جنوبی گوشے میں ہے جس کی مشرقی دیوار پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس کی تفصیل اور وضاحت مندرجہ ذیل ہے:

کتبہ پتھر کا ہے۔ الفاظ پتھر پر کندہ کیے گئے ہیں۔ پتھر پر سیاہ رنگ کا استر لگا کر الفاظ میں سنہرا رنگ بھرا گیا ہے۔ عبارت میں نقاشی (DRAWING) کا اس حد تک خیال رکھا گیا ہے کہ حاشیہ سطر اور قوس میں حسن تناسب پیدا ہو گیا ہے۔ کتبہ کے بالائی حصے پر یہ تحریر ہے:

محمد صلے علی رسول الکریم　　　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کے دائیں جانب یا حنان اور زیر سطر بالا قوس کے نقش میں یہ عبارت ہے:

قطعہ تاریخ پر ملال استاد زماں قبلہ و کعبہ حضرت مولانا مولوی قاسم علی صاحب مرحوم المتخلص خواہاں۔

کمانی تحریر کے نیچے اور وسط میں پہلی سطر: نقوی قادری برکاتی۔ دوسری سطر: آل احمدی ابوالحسنی نوری رحمۃ اللہ علیہ۔ تیسری سطر: از جویاں خلف حضرت موصوف۔ ان سطور کے نیچے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ ہے:

راہی خلد حضرت خواہاں شدہ　　　ہر کس از رنج و الم نالاں شدہ

شش محرم چہار شنبہ روز بود　　　روحش آزاد از تن زنداں شدہ

ذات عالی در بریلی فرد بود　　　خلق از فیض ہمہ خواہاں شدہ

کلک جویاں سال رحلت ایں نوشت　　　قدردان شاعری پنہاں شدہ

۱۳۵۷ھ

اس قطعہ تاریخ کے نیچے یہ عبارت ہے:

سید فرزند علی انجمؔ رضوی خلف سید اکبر علی تمیزؔ مرحوم شاگرد حضرت خواہاں مرحوم بریلوی

انجم فوت او ستاد عظیم　　　جائے خواہاں رفت۔ در باغ علیم

۱۳۵۷ھ

کتبہ مستطیل ہے۔ عربی عبارت نسخ میں اور اردو عبارت نستعلیق میں ہے۔ سید معظم علی جویاںؔ خلف تھا قاسم علی خواہاںؔ کا۔ سید فرزند علی انجمؔ خلف تھا سید اکبر علی تمیزؔ بریلوی تلمیذ عاشور علی خاں عاشورؔ لکھنوی (م ۱۸۶۱ء) کا۔ انجمؔ شاعری میں خواہاں کا شاگرد اور مشہور خوش نویس تھا۔ خواہاںؔ کا سلسلہ نسب سید شرف الدین امروہوی (م ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء) سے ملتا ہے جو امام علی نقیؑ (م ۲۵۴ھ/۸۶۸ء) کی اولاد امجد میں سے تھے۔ لہٰذا خواہاں اور ان کا پورا خاندان خود کو نقوی لکھتا ہے۔ برکاتی سے مراد شاہ برکت اللہ مارہروی (م ۱۱۴۳ھ) سے خواہاں کی نسبت طریقت ہے۔ اسی سلسلے سے خواہاں کی ابوالفضل شمس الدین سید آل احمد عرف اچھے میاںؒ مارہروی (م ۱۸۱۹ء) اور حضرت شاہ ابوالحسن نوری مارہروی (م ۱۹۰۵ء) سے نسبت طریقت کا اظہار کیا گیا ہے۔ خواہاں کی تاریخ وفات ۶ محرم ۱۳۵۷ ہجری مطابق ہے ۸ مارچ ۱۹۳۸ عیسوی کے۔

مندرجہ بالا کتبات کے علاوہ ضلع بریلی کے قصبات میں بھی تاریخی مساجد و مقابر، چاہ، پل اور حویلیاں ہیں جن کے کتبات کا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ ردہیلکھنڈ

اور تاریخ بریلی کے مورخین نے آثار قدیمہ اور کتبات سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ کتبات کبھی غلط اطلاع نہیں دیتے۔ تاریخ نویسی کے وقت ان سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ تاریخی واقعات کی تصدیق کا بہترین ذریعہ کتبات بھی ہیں۔ جس میں پرنسپ (JAMES PRINSEP) نے اشوک کی لاٹوں کے براہمی کتبات کو پڑھ کر ہی چندرگپت موریہ اور اشوک کے عہد کا تعین کیا اور یونانی مورخین کے بیانات کو جانچ کر ان کو غلط ٹھہرایا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں کتبات سنگ تراشی، نقاشی، خوش نویسی اور تاریخ گوئی کا ذریعہ بنے۔ اس عنوان پر بھی کتبات کا مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

کتبات کی حفاظت اور ان کا مطالعہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ادباء اور مورخین دونوں کو ہی اس کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔

حوالجات اور حواشی

[۱] مسعود نقوی۔ مضمون "بدایوں اور نوابین اودھ کا ۷۲ سالہ عہد حکومت"۔ ماہنامہ "مجلہ بدایوں"۔ کراچی۔ ستمبر ۱۹۹۳ء [۲] ایضاً [۳] عبدالعزیز خاں عاصی بریلوی۔ تاریخ روہیلکھنڈ۔ ص ۳۰۱ [۴] سید الطاف علی بریلوی۔ حیات حافظ رحمت خاں۔ ص ۳۳۴ [۵] ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب۔ چند شعرائے بریلی۔ ص ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ لکھنؤ ۱۹۷۶ء [۶] سید الطاف علی بریلوی۔ حیات حافظ رحمت خاں ص ۳۳۱ [۷] دیوان عزیز۔ لکھنؤ ۱۸۹۲ء کے صفحہ ۲۱۰ اور ۲۱۱ پر وہ فارسی غزل ہے جس کے مقطع سے خواہاں نے تاریخ وفات نکالی ہے۔ کتبہ میں شعر اول دیوان عزیز میں غزل کا تیسرا شعر ہے۔ دیوان عزیز میں مقطع غزل کے مصرعہ اول میں "ابر آید" کی جگہ "بر آید" ہے [۸] ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب چند شعرائے بریلی۔ ص ۱۳۲ [۹] بروایت جناب زیبا جامعی عمری ۹۰ سال ساکن محلہ ذخیرہ متصل پھاٹک برکات احمد بریلی۔

شعلہ بہ پیراہن کراچی سے گلستاں بہ کنار ایران تک

ایک ہفتے کی مطالعاتی سفر کی مختصر رُوداد

از جناب مولانا سید کلب صادق صاحب، لکھنؤ

بفضل ایزد منان تین سال بعد مجھے ایران کا ایک بار پھر ہفتہ بھر کا دورہ کرنا تھا اور اس سے قبل کچھ دن کراچی میں قیام کرکے تب ایران جانا تھا۔ بحمدہ یہ ارادہ پورا ہوا۔ جو کچھ دیکھا اور سمجھا اس کے تاثرات عرض کرتا ہوں۔ کراچی میں پہلے رہنا پڑا تھا لہذا اسی کی نسبت معروضہ پہلے پیش کرتا ہوں۔

دارالعلوم کورنگی کراچی کی اس اقامت میں اس دارالعلوم کے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ تعلیمی ادارہ تقریباً چالیس سال قبل بالکل معمولی پیمانے پر وجود میں آیا تھا۔ اس کے بابرکت بانی، پاکستان کے جید عالم دین حضرت مولانا محمد شفیع عثمانی تھے۔ موصوف کے انتقال کے بعد آپ کے فخر پدر فرزندوں حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی نے اس تعلیمی مرکز کے فروغ کے لیے اپنے وجود کو وقف کر رکھا ہے۔ میدان تعلیم و ترقی کے یکہ تاز د مجاہد جانباز حکیم محمد سعید صاحب (ہمدرد دواخانہ) کا بھی مکمل تعاون رہا ہے۔ ان مجموعی و متحدہ مساعی کے ثمرے میں ماشاءاللہ اس دارالعلوم کا پُرشکوہ کامپلکس کراچی سے تھوڑے ہی فاصلے پر کوئی ستر ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ طلاب کی تعداد تین ہزار سے اوپر ہے۔ امریکہ اور کناڈا سمیت متعدد ممالک کے طلاب بھی ہیں۔

عظیم الشان مسجد کی تعمیر کا کام ترقی پر ہے۔ کئی اقامت گاہیں بھی زیر تعمیر ہیں طلاب کرام کیلئے بھی اساتذہ عظام کے لیے بھی۔ تعلیم کے نصاب میں ہمارے روایتی علوم کے شانہ بہ شانہ عصری کیے جانے والے علوم بھی شامل ہیں۔ دارالعلوم کی علمی فضا کچھ ایسی دامنگیر ہوئی کہ میں اور میرے ساتھ تشریف لے گئے دوسرے حضرات، علماء کو وہاں کئی گھنٹے لگ گئے۔

ظہروظہرانے سے قبل مفتی رفیع عثمانی صاحب نے پاکستان کی موجودہ کیفیت کے پس منظر پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس مطول وسیر حاصل تفصیل کا خلاصہ بس یہ سمجھیں کہ استقلال پاکستان کے بعد وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں کے سامنے یہ مطالبہ رکھا گیا کہ اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں "اسلامی نظام" جلد از جلد نافذ کیا جائے۔ نواب زادہ مسلم لیگ کے بڑے رہنما اور پاکستان کے وزیر اعظم ضرور تھے مگر ملت بیضا اور شریعت مسلہ کی گیرائی و گہرائی اور لوچ لچک سے بخوبی آشنا نہ تھے۔ اس لیے انکے خیال میں کسی ملک کا نظام حکومت شریعت کی بنیاد پر، آج کی جدید دنیا میں استوار اور کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ بات بیچارے کھل کر کیسے کہتے ساتھ ہی ساتھ ان کی نظر میں امت کے مسلکی اور فقہی اختلافات کی شدت و نیرنگی بھی تھی۔ لہذا جب اسلامی نظام حکومت کے مطالبے نے زور پکڑا تو نواب زادہ لیاقت علی خاں نے ایک شاطر سیاست داں کی طرح یہ چال چلی کہ پارلیمنٹ میں یہ بیان دے دیا کہ "ہم تو اسلامی دستور نافذ کرنے پر تیار ہیں مگر شرط بس یہ ہے کہ ہر مسلک کے علماء "دستور اسلامی" کا متفقہ خاکہ پیش فرمائیں"۔ ان کا خیال تھا کہ "نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچیں گی"۔ یعنی نہ حضرات علماء متحد و متفق ہوں گے نہ اسلامی دستور کی تشکیل ہوگی۔ مگر توفیق حضرت الٰہی کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ ہوا یہ کہ شیعہ سنی، بریلوی، دیوبندی

اہل حدیث غرض کہ تقریباً سبھی مسالک فقہ و مکاتب فکر کے اکتیس[۳۱] ممتاز علماء دین نے بائیس[۲۲] نکات پر مشتمل مشترکہ خاکہ لیاقت علی خاں کو تھما دیا۔ اب لیاقت علی خاں پھنس چکے تھے۔ اسلامی دستور تیار کرانا ان کی مجبوری تھی۔ مگر عین اسی موقع پر ایک زبردست سازش بروئے کار آئی اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کو قاتل کی گولی نے تمام مشکلات کے ساتھ اسلامی دستور سازی کی زحمت سے بھی بچا لیا۔ سازش اتنی منظم تھی کہ حملہ آور موقع پر ہی مار دیا گیا اور نصف صدی گزرنے کے قریب پہونچی مگر سازش سے پردہ نہ اٹھ سکا۔

مولانا رفیع عثمانی صاحب نے آگے فرمایا کہ آپ اس کے بعد کے فرقہ وارانہ فسادات کی پاکستان میں تاریخ دیکھ لیں۔ یہ فساد ہمیشہ ایسے ہی موقع پر کرائے گئے، جب پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی بات اٹھی۔ کبھی یہ ہوا کہ ایک طرف "نفاذ فقہ جعفریہ" کی تحریک ابھاری گئی اور پھر اس کے سامنے "نفاذ فقہ حنفیہ" کی تحریک کھڑی کر دی گئی ہے اور پھر ان میں ایسی ٹکر ہوئی کہ "نفاذ شریعت محمدیہ" کی تحریک پس منظر میں جا کے ختم ہو گئی۔

دوسری ترکیب یہ اپنائی گئی کہ مختلف فرقوں کے شعلہ بیان مقرروں کے خدمات حاصل کر لیے گئے۔ ان تقریروں کی بدولت مقرر صاحبان تو نہال ہو گئے، مگر ملک کا نہال وجود خاک و خون میں غرق ہو گیا۔

مولانا نے یہ داستان تباہی آگے بڑھاتے ہوئے بتایا کہ "جہاں مطلب کے مقرر نہ مل سکے وہاں یہ کام تنگ نظر، طماع اور تفرقہ انگیز اہل قلم کو سونپا گیا۔ انہوں نے اشتعال زا تحریروں۔ کتابوں، رسالوں اور مضامین سے استعمار کی آتش نمرود کو ہوا دی

مہیا کیا۔ اسی پر بس نہیں ہوا۔ بعض حضرات علماء کی سادہ مزاجی و بے خبری سے فائدہ اٹھا کر تکفیر کے فتووں کی ہوا چلوادی گئی۔ اب ایک فرقہ دوسرے فرقے کو کافر بتانے لگا۔ مختصر یہ کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک نے جب بھی سر اٹھایا۔ عیار مکاروں نے گندم نما جو فروشوں یا مخلص بے خبروں کے اشتراک سے نظام اسلام کی تحریک کا سر کچل دیا"۔

مولانا کی پُر مغز گفتگو ایک حد تک میرے معلومات میں اضافے کا سبب ہوئی۔ امید ہے کہ ایسے ہی ذہین و زیرک با فہم و ذی بصیرت علماء کی قیادت کی بدولت شاید اب پاکستان میں کبھی فرقہ وارانہ فسادات کی نوبت نہ آنے پائے گی اور پاکستان کیا امید کرنا چاہیے کہ ہندوستان کے حضرات علماء بھی جناب مولانا عثمانی صاحب کے دردمندانہ ارشادات کو پیش نظر رکھیں گے۔

مسرت کی بڑی بات یہ ہے کہ اس دارالعلوم میں دارالاشاعت بھی ہے جہاں سے علمی موضوعات پر اردو، عربی اور انگریزی میں علمی کتابیں نکلتی رہتی ہیں۔ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت ہو کہ یہ اسی دارالعلوم کی خصوصیت نہیں۔ برادران اہل سنت کے تمام قابل لحاظ دینی مدارس میں تحقیقاتی مرکز قائم ہیں۔ جہاں سے ہر دینی موضوع پر وافر تعداد میں کتابوں کی اشاعت ہو رہی ہے۔ "کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!"

کراچی میں کچھ روز ٹھہر کے میں بدھ ۲۵؍ اکتوبر کو تہران پہونچا۔

تہران | جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہ ایران کا سفر تین سال بعد ہوا تھا۔ اب جو دیکھا تو ایسا لگا کہ تہران نے اپنا چولا بدل لیا ہے۔ بالکل ایک نئی کیفیت خوشگوار و دل آویز۔ ایک کروڑ سے بھی زیادہ آبادی کے اس شہر میں جس گلی سے، سڑک سے گزر ہوا، صاف و شفاف نظر آئی۔ تین سال پہلے یہ پایا تھا کہ بجلی دن میں کئی کئی بار غائب ہو جاتی تھی، مگر

اب منٹ بھر کے لیے بھی دھوکا نہیں دیتی۔ گاڑیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ مگر "ٹریفک جام" رخصت ہو چکا ہے۔ فلائی اوور، رنگ روڈ اور پر ہجوم چوراہوں پر کیمرے لگا کے ٹریفک کو اس خوبصورتی سے کنٹرول کیا جاتا ہے کہ سواریوں کی رفتار میں بھی خلل نہیں پڑتا۔

شہر کا جنوبی علاقہ جو پہلے غربت زدہ و پسماندہ تھا، مکانات چھوٹے چھوٹے، سڑکیں پتلی، جہاں گندگی اور غلاظت کا سامنا رہتا تھا وہاں اب شاندار فلیٹس اور اپارٹمنٹ، کشادہ صاف و پاکیزہ سڑکیں جن کے وسط میں اور کناروں پر سبزہ زار۔

جو حال تہران کا تھا، وہی ہر اس شہر کا پایا جہاں جانا ہوا۔ مگر چمک دمک سے معمور مناظر کے پس پشت کچھ تکلیف دہ باتوں کی سن گن بھی ملی۔ مجھے بتایا گیا کہ اخلاقی معیار میں وہ انقلاب کے شروع شروع والی بات نہیں۔ بازار بھی چڑھ گیا ہے۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ سرکاری اداروں میں ہمارے ہندوستان کا "سویدھا شلک" بھی گھس آیا ہے۔ علماء میں کچھ کچھ فرد ایسے بھی ہیں جو مادیت مزاج و رفاہیت پسند ہو گئے ہیں۔ ان حضرات کے درمیان حریفانہ چشمکوں کی بھی خبریں ہیں۔ گداگر اور فقیر بھی۔ اکا دکا ہی۔ مگر نظر آجاتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ پیشہ ور قسم کے لوگ ہیں۔ کیونکہ مشہد میں ایک گداگر خاتون سے میں نے جب معلوم کیا کہ "آپ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کس قدر رقم درکار ہے؟" بتایا گیا کہ "تین ہزار تومان کافی ہوں گے"۔ یہ رقم مہیا ہو گئی۔ لیکن اگلے ہی دن یہ ہاتھ پھر چادر کے باہر پھیلا ہوا دکھائی پڑا۔ ان کمزوریوں کے سبب کچھ لوگ حکومت پر اعتراض و شکوہ کرتے بھی ملے۔

مگر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حکومت غافل نہیں ہے۔ اپنے شہریوں کی

پریشانیوں کا احساس رکھتی ہے۔ مگر اس کی معذرت یہ ہے کہ بجٹ کا بہت بڑا حصہ تعمیرات وصنعت پر صرف کیا جارہا ہے۔ اس لیے ابتدائی دور میں تو پریشانیاں ناگزیر ہیں۔ مگر یہ وقتی ہیں۔ بقول صدر ایران جناب رفسنجانی ہمارے پاس مختصر سی رقم ہے اور ہمارا بچہ ٹانی کے لیے مچلا ہوا ہے۔ مگر ہم اس رقم سے اسے ٹانی کی بجائے کتاب دلانا چاہتے ہیں۔ چاہے اس وقت بچہ ٹانی کے لیے رونے ہی لگے۔ مگر اس کی آیندہ زندگی تو مٹھاس سے خالی نہ رہے۔ میری رائے میں اس بات سے صداقت جھلکتی ہے۔ اس لیے کہ اس وقت ایران صنعتی لحاظ سے خود کفالت کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔ ایرانی مصنوعات اب بین الاقوامی مصنوعات کی ہم پلہ ہیں اور ایرانی اسے مجبوری یا مروت میں نہیں، خریدنے کے قابل سمجھ کے خوشی خوشی خریدتے ہیں۔

میرا یہ سفر اگرچہ خود میرے اپنے وسائل سے تھا مگر تہران میں اترا تو ایرپورٹ پر ہی پتہ چل گیا کہ حکومت ایران از راہ اخلاق میری میزبانی کرنا چاہتی ہے۔ سفر کا مقصد دریافت کیا گیا تو میں نے عرض کیا کہ زیارت سب سے مقدم ہے۔ پھر ثانوی مقصد یہ ہے کہ یہاں کے زیادہ سے زیادہ علمی وتحقیقاتی مرکزوں کو دیکھوں۔ بس یہی مقصد سفر ہے۔

مشہد مقدس | دوسرے ہی دن میں نے مشہد کی پروانہ پکڑلی تاکہ حضرت ضامن ثامن امام علی بن موسیٰ الرضاؑ کے روضہ مقدسہ کی زیارت سے ایک بار پھر شاد ومستفید ہوسکوں۔

کتب خانہ آستان قدس | مشہد کی آستان قدس لائبریری میں اس سے قبل کے سفروں میں میرا اچھا خاصہ وقت گزرا ہے۔ یہ کتب خانہ پہلے ہی بہت منظم ومرتب تھا، لاکھوں کی تعداد میں مطبوعات کے علاوہ، یہ نایاب مخطوطات کا خزانہ بھی ہے، انشاء اللہ جلد ہی یہ لائبریری اپنی نوتعمیر عظیم الشان عمارت میں منتقل ہوجائے گی، جہاں پچاس لاکھ

کتابوں کی گنجائش ہوگی اور ان سے استفادہ کے لیے تمام ضروری وجدید ترین سہولتیں فراہم ہوں گی۔ افسوس ہے کہ تعطیل کے سبب میں نوتعمیر عمارت کو اندر سے نہ دیکھ سکا۔ مشہد میں شب وروز جمعہ گزار کر تہران ہوتا ہوا قم آگیا۔

قم مقدسہ | یہاں حاضری کے دوران "کتب خانہ مرعشیؒ" دیکھنے کا موقع بہرحال مل گیا۔ یہ عظیم کتب خانہ ایران کے مشہور عالم دین ومرجع وقت آقائے شہاب الدین مرعشیؒ (ولادت ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء۔ وفات ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء) کا قائم کردہ ہے۔

کتب خانہ مرعشی | مرعشی رحمہ اللہ کو مخطوطات کی جمع آوری کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا۔ اس عالم اجل نے بہتیرے مخطوطات، معمولی کام کرکے اس سے ملنے والی اجرت سے خریدے۔ ایک مخطوطہ پر عربی میں یہ لکھا میں نے بچشم خود مشاہدہ کیا "یہ مخطوطہ میں نے فاقے پر فاقہ کرکے خریدا ہے اور اب فاقے پر بیس گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں اور یہ عبادت لکھنے میں اب نقاہت کی وجہ سے دشواری ہورہی ہے"۔ اس کتب خانے میں اس وقت چار لاکھ سے زاید مطبوعات اور چھبیس ۲۶ ہزار سے زاید مخطوطات ذخیرہ ہیں۔ اور یہ سب نادر ونایاب ہیں۔ اس کتب خانے کی موجودہ عمارت کی بھی توسیع بڑے پیمانے پر ہورہی ہے، مخطوطات کی نگہداشت کا مجھے وہی اہتمام ومعیار نظر آیا جو یورپ وامریکہ کی لائبریریوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔

اس لائبریری کا نظام کمپیوٹرائزڈ ہے۔ "بیمارستان کتب" (کتابوں کا اسپتال) تو بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں کتابوں کی حفاظت، مرمت اور ان سے استفادہ کے لیے انتہائی قیمتی اور جدید ترین مشینیں مہیا ہیں اور فن میں ماہر افراد عشق واخلاص کے ساتھ خدمات میں لگے رہتے ہیں۔ میں نے جدید ترین تکنیک کے ذریعے نیم ضائع اور

ضایع مخطوطات میں از سرنو زندگی کے جو آثار دیکھے تو جدید ٹکنالوجی کی مسیحا نفسی کا اقرار کرنا پڑا۔

ایران کے بعض تحقیقاتی ادارے | شیعہ مصادر میں حضرت امام جعفر صادقؒ کی ایک روایت ملتی ہے:

"وہ زمانہ بھی آئے گا جب اسلامی علوم خود گھر گھر اور دردریوں پہونچ جائیں گے کہ پردہ نشین خواتین بھی یہ نہ کہہ سکیں گی کہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا و کاربند ہونے میں ہم قاصر تھے مقصر نہ تھے"

ایران کے متعدد دینی مراکز اس ارشاد کی نشر و اشاعت کے تازہ ترین وسائل کو کام میں لاکے عملی تصدیق کردینا چاہتے ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں بس ایسے دو ہی دینی مرکزوں کو وقت کی کمی کے باعث دیکھ سکا۔

المعجم الفقہی | یہ ادارہ ایران کے ایک اور عالم اجل مرجع تقلید محمد رضا گلپائگانی رحمہ اللہ (ولادت ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء/ وفات ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳ء) کا قائم کردہ ہے اور مرحوم کی بنا کردہ شاندار اور وسیع مسجد کے پہلو میں ایک کشادہ و خوبصورت عمارت میں جاری ہے۔

اس ادارے کے ذریعے قرآن حکیم کے علاوہ جعفری (شیعہ)، حنفی، مالکی، حنبلی، شافعی، ظاہری اور زیدی مسالک کی فقہ و اصول فقہ سے متعلق چھ سو سے زاید بنیادی کتابوں (مصادر) اور ساتھ ہی ساتھ علم فقہ سے متعلق تمام الفاظ، مصطلحات، اعلام (اشخاص)، لغات، موضوعات، عنوانات نیز مختلف مسالک کی تمام مستند تفسیروں کو انتہائی ماہرانہ طریقے سے مکمل طور پر کمپیوٹرائزڈ کردیا گیا ہے۔

ذوق تحقیق رکھنے والے حضرات ہی اس کی افادی قدر و قیمت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

کسی بھی مسئلے کی تحقیق کے لیے تلاش اور ورق گردانی کا وقت مہینوں اور ہفتوں سے سمٹ کر منٹوں اور سکنڈوں میں بدل گیا ہے۔ اس معجم کے مدیر ایک جید عالم جناب علی الکورانی ہیں۔ اس صاحب جبہ و دستار بزرگ کے ہاتھ کمپیوٹر کے بٹنوں پر کمپیوٹر کی رفتار سے چلتے دیکھ کر انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔

مرکز تحقیقات کامپیوتری علوم اسلامی | قم میں یہ سنٹر اب سے چھ سال قبل رہبر انقلاب اسلامی جناب سید علی خامنہ ای کی تحریک پر قائم ہوا تھا۔ یہ عظیم مرکز جدید ترین کمپیوٹروں سے آراستہ ہے اور اس میں تین "پروگرام" تیار کیے گئے ہیں۔

۱۔ معجم الالفاظ - اس کمپیوٹر پروگرام میں قرآن مجید، نہج البلاغہ کے علاوہ حدیث، تفسیر، رجال، فلسفہ، منطق اور مدارس علمیہ کے نصاب میں شامل تمام موضوعات و مضامین سے متعلق مستعمل الفاظ کو اس طرح کمپیوٹرائزڈ کردیا گیا ہے کہ ان لاکھوں الفاظ میں سے ایک ایک لفظ کے متعلق تمام و کمال تفصیلات اور ان کے تعلق سے اٹھ سکنے والے ممکنہ سوالات، مثلاً یہ الفاظ کن کن نصوص و عبارات میں اور کن کن کتب میں آئے ہیں۔ معانی کیا کیا ہیں، مادہ (روٹ) کیا ہے، مشتقات کون کون سے ہیں اور کہاں کہاں استعمال میں آئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ آپ جو بھی معلوم کرنا چاہیں گے ان کے جوابات چند سکنڈ میں اسکرین پر آجائیں گے۔

۲۔ المعجم الموضوعی - اس کمپیوٹر پروگرام کے ذریعے حدیث، فقہ، اصول فقہ، فلسفہ، منطق، تاریخ، کلام سے متعلق تمام مصادر و ماخذ میں زیر بحث آنے والے تمام موضوعات اور ان کے ضمنی و ذیلی موضوعات کو انتہائی ماہرانہ طریقے سے یوں کمپیوٹرائزڈ کردیا گیا ہے کہ ان علوم سے متعلق کسی بھی موضوع یا ذیلی موضوع سے متعلق تمام تفصیلات اور تمام

ممکنہ سوالات کے جوابات پلک جھپکتے نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔

۳۔ معجم الرجال۔ اس پروگرام کے ذریعے فرقۂ شیعہ کی تمام کتب حدیث کے سارے راویوں کو مع مکمل تفاصیل مثلاً نام، شیوخ، تلامذہ، عہد، درجہ بندی، باہمی رشتوں اور رابطوں نیز ان سے مروی روایات کا شمار اور حوالے اور اس کے علاوہ بھی دیگر ضروری اطلاعات کو یوں یکجا کر دیا گیا ہے کہ وادی تحقیق کے خارزار، گل و ثمر سے لدی ڈالیوں کے اشجار کا چمن بن گئے ہیں۔ چٹکی بڑھایئے اور گل مراد توڑ لیجیے، ہاتھ بڑھایئے اور ثمر تمنا لے لیجیے۔

اس ادارے سے علوم دین کے طلاب و طالبات نیز دیگر تحقیق کار بہت بڑی تعداد میں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان پروگراموں کو معمولی قیمت پر مہیا کرنے کا انتظام بھی ہے تاکہ بڑے سے بڑے پیمانے پر ان کا افادہ عام ہو سکے اور کمپیوٹر کی محض ایک "ڈسک" کی صورت میں گھر گھر کتب خانے مہیا کیے جا سکیں۔ یہ ہے سائنس کی برکت اور یہ ہے عظیم الشان ایران کے دانش وران کی حکمت لا بشیئ من آلاءک ربنا نکذب

معہد قرآن کریم (تہران) اس ادارے کے بانی جناب فومنی (PHOMNI) ہیں جو ایک نہایت متبحر، متعدد زبانوں سے آگاہ عالم دین ہیں۔ وہ متعدد ممالک میں ایران کے سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ آقائے فومنی کو قرآن مجید کے ساتھ کچھ ایسا والہانہ عشق ہے کہ سفارت کا منصب ترک کر کے اپنی زندگی، نشر قرآن، معرفت قرآن، حفظ قرآن اور معاشرے میں قرآنی اخلاق پیدا کرنے کے لیے گویا وقف کر دی۔

نشر قرآن آقائے فومنی علم کی طرح لباس اہل علم سے بھی مزین ہیں، عمامہ بہ سر، قبا در بر، عبا بر دوش، علماء کی زی کا مکمل نمونہ مگر فکر و فہم تازہ بہ تازہ، نو بہ نو، دقیانوسیت کا اثر دور دور نہیں، وہبی ذہانت، اکتسابی جدید ٹکنالوجی سے آشنائی، چند سطروں میں نہ تو

ان کی خدمات کا احاطہ ممکن ہے نہ ان کی جامعیت کی عکاسی۔ اتنی سادہ و پرکار شخصیت کہ بس صنعت صانع پر سبحان اللہ و ماشاء اللہ کہتے رہیے۔ مختصر بس یہ ہے کہ آپ نے اپنے چابک دست رفقاء کی مدد سے کمپیوٹر کا ایسا ایک سی ڈی رام (C.D.ROM) تیار کیا ہے کہ اس پانچ گرام کی "ڈسکیٹ" میں دنیا کے سات مشہور و ممتاز قاریوں کے لہجوں میں قرآن کی مکمل قرأت اور پھر انگریزی، جرمن، فرانسیسی، فارسی، ترکی اور اسپینی زبانوں میں ترجمے ریکارڈ کر دیے گئے ہیں اور کمپیوٹر کی اس ڈسکیٹ کو براہ راست فون سے مربوط کر دیا گیا ہے، آپ فون پر ۱۱۴ ڈائل کریں۔ کمپیوٹر دریافت کرے گا کہ آپ کس سورے کی، کن آیات کی سماعت کرنا چاہتے ہیں؟ آپ سورے اور آیتوں کے نمبر دبا دیں پھر فوراً ہی فون استفسار کرے گا کہ کس قاری کے لہجے میں؟ آپ جیسے ہی قاری کا کوڈ نمبر دبائیں گے آپ کا کان اسی قاری کے لہجے میں تلاوت قرآن سے معمور ہو جائے گا۔ تلاوت ختم ہوگی تو کمپیوٹر پھر دریافت کرے گا کہ آپ ترجمہ کس زبان میں سننا چاہتے ہیں۔ زبانوں کے بھی کوڈ نمبر ہیں۔ جس زبان کا معینہ کوڈ نمبر آپ دبائیں گے اسی زبان میں ترجمہ گوش گزار ہونے لگے گا۔ اگر آپ کے یہاں کمپیوٹر ہے تو آپ سی ڈی رام (C.D.ROM) کو اپنے ٹھکانے پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ سی ڈی رام اس وقت مغربی ممالک کے مختلف اسلامی مراکز میں کمپیوٹر سے مربوط ہے۔ وہاں کے مسلم و غیر مسلم حضرات اس سے زبردست استفادہ کر رہے ہیں۔ میں یہ سی ڈی رام (C.D.ROM) اپنے ساتھ لایا ہوں اور اس فکر میں ہوں کہ اس سے اپنے ملک میں بھی فائدہ اٹھانے کی صورتیں پیدا ہوں۔ انشاء اللہ الحکیم

حفظ قرآن اس متبرک و فیض رساں معہد کا دوسرا مرحلہ ہے حفظ قرآن کریم۔

حفظ قرآن کریم کے لیے نہ صرف یہ کہ جدید ترین آڈیو ویڈیو (شنوا و بینا) تکنالوجی کو اپنایا گیا ہے، بلکہ حفظ کے لیے حفظ قرآن کی نئی تکنیک اختیار کی گئی ہے۔ عام طور پر حفظ قرآن کا پہلا مرحلہ ناظرہ ہوتا ہے پھر حفظ ہے۔

نومنی صاحب کا فلسفہ یہ ہے کہ بچہ زبان سنکر سیکھتا ہے پھر اس سیکھی ہوئی زبان کو پڑھنا اور لکھنا سیکھتا ہے۔ اس لیے حفظ میں یہی فطری طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔ پہلے کیسٹس کے ذریعے ایک مخصوص سسٹم کے تحت مرحلہ وار طریقے پر قرآن صحیح تجوید کے ساتھ سنا سنا کر یاد کرایا جاتا ہے پھر اس کی شناسائی قرآنی املا سے کرائی جاتی ہے۔

اس سسٹم کی مدد سے اس وقت ایران میں ستر ہزار سے زیادہ حفاظ تیزی کے ساتھ تیار ہو رہے ہیں، میں یہ سسٹم بھی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ کوئی دینی ادارہ اس سے استفادہ کرنا چاہے تو بسم اللہ۔

یہ ادارہ ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ حفظ کے بعد انہیں حفاظ قرآن کو قرآن کے معانی و مطالب تفسیر و تعلیمات سے آگاہ کیا جائے گا۔

اور پھر ان کے اخلاق و کردار و افکار کو قرآنی سانچے میں ڈھالنے کا مرحلہ ہوگا۔ وما توفیقنا الا باللہ۔

عصری علوم کی تعلیم | وقت کی تنگ دامانی مجھے بار بار افسردہ کرتی رہی۔ اس بات پر بھی تاسف ہوا کہ میں صرف ایک یونیورسٹی دیکھ سکا۔ مگر اس کی طمانیت بھی تھی کہ میں نے وہ یونیورسٹی دیکھی جس کے معاینے و مشاہدے کی عام اجازت نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ دیگ میں کیا اور کیسا ہے اسے جاننے کے لیے بس ایک ہی دانہ کافی ہوتا ہے۔

جس یونیورسٹی کے دیکھنے کا مجھے اعزاز ملا۔ اس کا نام "دانش گاہ امام حسین" (امام حسین

یونیورسٹی) ہے، جو پاسداران انقلاب کے لیے مخصوص ہے یہاں پاسداروں کو فوجی و حربی تربیت کے ساتھ عصری نیز اسلامی نظریاتی تعلیم سے بھی مسلح و مجہز کیا جاتا ہے۔ وقت زیادہ نہ تھا پھر بھی میں نے جلدی جلدی بہت کچھ دیکھ ڈالا تو پایا کہ یہاں وہ تمام شعبے ہیں جو کسی معیاری وبلند پایہ یونیورسٹی میں ہوتے ہیں۔ تعلیم کا معیار بھی خاصہ بلند ہے۔ اس کا اندازہ مجھے بس ایک ہی شعبے سے مل گیا۔ یعنی سوشل سائنسز کا شعبہ۔

تھوڑا وقت گزار کر جسے میں نے دیکھا تھا۔ وہاں اس وقت قیادت (لیڈرشپ) کے جدید نظریوں اور تھیوریوں پر لکچر ہو رہا تھا۔ میں اس مضمون میں دسترس نہیں رکھتا پھر بھی محسوس کر رہا تھا کہ استاد کو مضمون پر کامل عبور ہے۔ تعلیم کا انداز بھی دلکش و جاذب تھا۔ طلبہ بھی پوری طرح متوجہ لگ رہے تھے۔ معیار تعلیم کے ساتھ عمارت کی نفاست اور استاد وشاگردوں کے اخلاق نے بھی متاثر کیا۔

اس دانش گاہ کے قیام کے پس پشت کارفرما فلسفہ یہ ہے کہ اسلامی فوج کے سپاہیوں کو دوسرے سپاہیوں سے ممتاز ہونا چاہیے۔ وہ جاہل مزاج، اکھڑ اور اجڈ نہ ہوں۔ بلکہ تعلیم یافتہ ہوں تاکہ میدان رزم بھی درپیش ہو تو ان کے اقدامات نظریاتی ہوں اور وہاں بھی یہ اعلا اسلامی اخلاق کا نمونہ بنے رہیں۔

ٹیکنیکل اینڈ انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر کرج | مضافات تہران میں واقع، سرسبز و شاداب پہاڑ کے دامن میں تکنیکی و صنعتی تربیت کا یہ شاندار مرکز دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کاموں کی فراوانی اور وقت کی تنگ دامانی کے باوجود میں نے چار گھنٹے گزارے پھر بھی ناآسودگی کا احساس رہا۔

عمارت بہت وسیع، خوبصورت، مشین نئی سے نئی، پڑھانے والے اپنے فن میں

ماہر اور مخلص، پڑھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ پڑھ لینے کا ہوگا۔ صنعت و حرفت سے تعلق رکھنے والی شاید ہی کوئی چیز ہو جو یہاں منگوائی پڑھائی نہ جاتی ہو۔

ایرانی زندگی کے تمام شعبوں کی طرح یہاں بھی خواتین کی ساجھے داری برابر کی ہے۔ مگر سب حجاب اسلامی کی پابند، عمارت صاف، شفاف آلات و اوزار آئینہ کی طرح چمکتے ہوئے۔ گرد و غبار کا نام نہیں، میل کچیل کا نشان نہیں۔ محض ظاہری و مادی ماحول کی بات نہیں، اخلاقی و روحانی ماحول بھی ویسا ہی پاک و پاکیزہ و معصومانہ سا۔

خواتین کی یہی علمی، دینی اور اخلاقی بیداری آیندہ نسلوں کی علمی، اخلاقی اور دینی سربلندیوں کی امین و ضامن ہے۔

سفر کی یادگار تین ناقابل فراموش واقعے

ایران کے اس سفر میں ایسے تین تجربے ہوئے جن کو میں شاید زندگی بھر نہ بھلا سکوں۔ ان میں سے ایک کا تعلق ایک پانچ سالہ بچی سے ہے دوسرے کا ایک تیس سالہ جوان سے اور تیسرے کا ایک ساٹھ سال کے بوڑھے سے۔

مشہد مقدس میں میرا قیام ایک رشتہ دار کے یہاں ہوا کرتا ہے۔ وہاں پہونچا تو ایک پانچ برس کی بچی دوڑی دوڑی میرے پاس آگئی۔ مجھے بھولے بھالے معصوم بچوں پر ہمیشہ پیار آتا ہے۔ میں نے اس بچی کو مانوس بنانے کے لیے اس سے کہا "آؤ ہم کچھ کھیلیں"۔ میری اس پیش کش کا، پانچ برس کی اس بچی نے جو جواب دیا اس نے مجھے ششدر کر دیا۔ "من حوصلۂ بازی کردن ندارم اما حوصلۂ قرآن خواندن کہ دارم"۔ "مجھے کھیلنے سے دلچسپی نہیں ہے لیکن قرآن پڑھنے کا شوق ہے"۔ تھوڑی دیر کے لیے بالکل گونگا سا ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ ہمارے ملک کے اکثر و بیشتر جوان بلکہ بوڑھوں تک کی دلچسپیاں صرف لہو و لعب اور کھیل کود تک محدود ہیں اور یہاں کے بچوں تک کو قرآن سے یہ عشق و شغف! پھر میں نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا کہ "بیٹی! تمہیں قرآن کی کتنی آیتیں یاد ہیں؟" اس نے فخر و اعتماد کے ملے جلے لہجے میں جواب دیا کہ متعدد سوروں کے علاوہ قرآن حکیم کے سب سے طویل سورۃ "البقرہ" کی ساٹھ آیتیں۔ میں نے کچھ سنانے کی فرمائش کی تو اس نے بے جھجک، نہایت درست تجوید کے ساتھ مسحور کن لہجے میں یہ آیتیں سنانا شروع کر دیں۔ میں حقیقتاً وجد میں آگیا۔

میں نے اب تک پوری زندگی میں کہیں بھی پانچ سال کی اتنی ذہین، اتنی سمجھ دار اور اتنی پُر اعتماد، دین و قرآن سے ایسا شغف رکھنے والی بچی نہیں دیکھی۔ اس لیے عرض کیا کہ یہ نادر خوشگوار تجربہ میں زندگی میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔

دوسرا یادگار واقعہ تہران کا ہے، یہ تب پیش آیا جب میں "دانش گاہ امام حسینؑ (امام حسینؑ یونیورسٹی) کے کچھ شعبوں کو دیکھ رہا تھا۔ سماجیات کے شعبے (سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ) میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ ایک تیس سالہ وجیہ اور چاق و چوبند جوان میرے قریب آیا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید مجھے فارسی نہ آتی ہو، مجھ سے رواں اور شستہ انگریزی میں گفتگو شروع کر دی۔ میں نے اس کو بتایا کہ انگلش میں گفتگو کی ضرورت نہیں، میں فارسی سمجھ اور بول سکتا ہوں۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ "تم نے یہ انگلش کہاں سے سیکھی"؟ (چونکہ ایران پر کسی زمانے میں بھی انگریزی سامراج کا براہ راست تسلط نہیں رہا۔ اس لیے وہاں انگریزی زبان سے آشنا افراد خال خال ملتے ہیں) اس نے بتایا کہ "اب مجھے انگریزی کے علاوہ عربی اور فرنچ بھی آتی ہے۔ میں نے یہ تینوں زبانیں عراق کی ۸ ½ سالہ قید میں سیکھی ہیں"۔ اس نے آگے بتایا کہ "میں جنگ کے دوران زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ ساتھی مردہ سمجھ کر مجھے میدان میں چھوڑ کر

جا چکے تھے اور میرے اعزہ کو میری شہادت کی خبر دے دی گئی تھی۔ لیکن میں زندہ تھا عراقی سپاہیوں نے اٹھا لیا۔ علاج معالجہ ہوا۔ اللہ نے شفا بخشی۔ پھر جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ڈال دیا گیا۔ ایسی سختیاں کہ بیان نہیں ہو سکتیں۔ یہاں تک کہ نماز پڑھنے پر بھی پٹائی ہوتی تھی۔ اس کیمپ میں کچھ عراقی قیدی بھی تھے۔ ان سے میں نے عربی بولنا اور لکھنا سیکھا۔ کچھ فرنچ جاننے والے قیدی تھے، ان سے فرنچ سیکھی۔ کچھ انگریزی داں تھے، ان سے انگریزی سیکھی۔ میں یہ تینوں زبانیں بول اور لکھ سکتا ہوں۔

اس گفتگو کے بعد بعض دیگر حضرات سے معلوم ہوا کہ یہ اسیری ایرانی سپاہیوں کے تحصیل علم کے جذبے کو قید نہ کر سکی۔ جیل جہاں نماز ادا کرنے تک پر اذیت دی جاتی تھی۔ وہاں نہ کتابیں، نہ لکھنے پڑھنے کا سامان، نہ لکھنے پڑھنے کی اجازت۔ ان اسیران جنگ نے لکھنے پڑھنے کا یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا کہ جیل کے خاردار تاروں والے حصار سے ایک کانٹا کسی طرح توڑ مروڑ کر نکال لیتے اور گویا یہی کانٹا قلم بن جاتا، سلیٹ کا کام کلائی دیتی۔ اسی کانٹے سے حروف والفاظ لکھے جاتے۔ کانٹے کی ہلکی رگڑ سے کھال کی خشکی سفید رنگ کے حروف والفاظ کی شکل اختیار کر لیتی تھی اور جب یہ الفاظ یاد ہو جاتے تو انہیں ہاتھ سے رگڑ کر محو کر دیا جاتا اور دوسری تحریر اسی ترکیب سے قلم بند ہو جاتی[1]۔ میں نے تعلیم وتعلم کا ایسا عجوبہ نہ کبھی سنا تھا، نہ پڑھا تھا، نہ دیکھا تھا اور یقین ہے کہ مستقبل میں بھی شاید دیکھنے سننے یا پڑھنے کو نہ ملے گا۔ لہذا یہ جیتے جی فراموش نہیں ہو سکتا۔

تیسرا اور اس سفر کا آخری تجربہ بھی تہران میں ہوا۔ رہبر انقلاب آیۃ اللہ سید علی خامنہ ای سے ملاقات کا وقت ۱۱ بجے دن کا تھا۔ سیکورٹی کے مراحل سے گزرتا ہوا ایک

[1] معارف: شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ قلم دوات قید خانے میں چھین لیا گیا تھا تو آخری تحریر کوئلے سے لکھی تھی۔

بڑے کمرے میں پہونچا، جہاں زمین پر فرش تھا اور دیواروں پر آیات قرآنیہ کے کتبوں کی آرائش۔ راقم سے علیحدہ گفتگو کے بعد دوسرے حضرات سے احوال پرسی اور مختصر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ لوگوں نے زبانی یا تحریری شکل میں اپنے معروضات پیش کرنا شروع کیے۔ ایک صاحب نے گفتگو کو ذرا طول دیا۔ ان کی باتیں ختم بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ کہیں دور سے ظہر کی اذان سنائی دی۔ کانوں سے اللہ اکبر کی آواز ٹکرائی اور آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ جمہوری اسلامی ایران کے اس سب سے بڑے لیڈر کا رنگ زرد ہو گیا اور زبان پر یہ کلمے آئے "فی الحال اپنی گفتگو روک دیں، میں کیا کروں اذان کی آواز سن کر میرے ہوش حواس اڑ جاتے ہیں، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے"۔ چنانچہ گفتگو رک گئی۔ وہیں نماز کی صفیں بچھ گئیں اور ایک مرد مومن نے اذان دے دی اور پھر رہبر انقلاب کی اقتدا میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔

کسی کے لیے یہ معمولی بات ہو سکتی ہے لیکن ان سطروں کے راقم طالب علموں کے لیے جسے خوش بختی سے علمائے صالحین ومتقین کی زیارت ہی نہیں صحبت ومعیت وخدمت کے بے شمار مواقع میسر ہوئے ہیں یہ منظر امٹ یادگار رہے۔ صدائے اذان کا کسی چہرے پر اس طرح اثر انداز ہونا پہلے پہل دیکھنے میں آیا۔ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔ میں مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ لیکن پھر بھی خیال یہی ہے کہ یہ اولین وآخرین نظارہ ہے۔ آپ باور فرمائیں کہ خوف وخشیت الٰہی اور معراج مومن کی للک کا یہ امتزاجی تاثر میرے حافظے سے جیتے جی مٹنے والا نہیں۔ مٹے گا بھی کیسے! جب کہ جانتا ہوں کہ خوف وخشیت الٰہی جس قدر دل میں جگہ بناتا جائیگا اسی قدر ماسوی اللہ کا خوف واندیشہ نکلتا جائے گا۔
آپ باور فرمائیں کہ یہ سطریں ملک یا بیرون ملک کسی کی مسکراہٹ خریدنے کیلئے

نہیں ہیں۔ میں نے اپنی بے نہایت مشغولیت میں سے اس تحریر کا وقت بڑی زحمتوں اور صعوبتوں سے اس لیے نکالا ہے کہ ان واقعات سے جو نتیجہ میں نے برآمد کیا ہے اسے اس جماعت کے سامنے پیش کر سکوں جس میں تعلیم کے فروغ اور بے علمی کے استیصال کے لیے میں نے اپنے کو وقف کر دیا ہے، ذکر فضائل و اہل بیت کے سوا اسما مغر طالب علمانہ سرگرمیاں ترک کر دی ہیں۔ اس صورت حال سے میرے بعض قریبی رفقا، جن کی نظر میں میری کچھ علمی حیثیت ہے وہ بہت ملول رہتے ہیں، دیکھتا ہوں کہ ملال اب آزردگی طرف بڑھ رہا ہے، لیکن مدینہ و باب مدینہ علم کے نام لیواؤں میں "انگوٹھا ٹیپ" بھی تو برداشت نہیں ہو سکتی۔ اسلیے یہ نتائج ان کے سامنے رکھتا ہوں۔ شاید کہ اتر جائے کسی دل میں مری بات۔

جو نتیجہ میں نے نکالا ہے وہ سیدھے سادھے لفظوں میں مختصراً یہ ہے کہ جس ملت میں پانچ سالہ بچے سے لے کر ساٹھ سالہ سن تک میں دین کا ایسا عشق ہو، اسلام جس کی رگ رگ نس نس میں رچا بسا ہو، علم و تعلیم کی ایسی لگن اور اتنی پیاس ہو، اس ملت کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ اگر کبھی "سپر پاور" ہونے کے زعم میں کسی نے اس ملک سے جارحانہ سلوک کی جسارت کی تو اسے اسی ہزیمت و فضیحت کا وہاں بھی سامنا کرنا پڑے گا، جیسی لبنان اور ویت نام میں سامنا کرنا پڑا تھا۔

کیا ہم اپنے میں یہ اوصاف پیدا کر کے ویسی ہی ناقابل تسخیر ملت نہیں بن سکتے کہ ایک بار پھر دعویٰ کیا جا سکے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔

اخبار علمیہ

گذشتہ ماہ نئی دہلی سے اردو بک ریویو نامی رسالہ کا اجرا ہوا، اس ماہنامہ کا مقصد اردو زبان میں تصنیف و تالیف کی موجودہ رفتار کا جائزہ لینا اور ناشرین کتب کے مسائل اور ان کا حل تلاش کرنا ہے۔ انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں میں اس قسم کے رسائل نے اپنی اہمیت و افادیت ثابت کر دی ہے، اردو میں ایسے رسالہ کی ضرورت تھی اور اس کے پہلے شمارہ کو دیکھ کر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جناب اسرار عالم و عارف اقبال صاحب کی ادارت میں یہ ضرور کامیاب ہوگا، پہلا شمارہ ۳۲ صفحات کا ہے اور کاغذ کی کمیابی، پبلشنگ اور فنی مہارت، جدید پرنٹنگ پریس کے رجحانات، اردو کی نصابی کتابیں جیسے مسائل پر بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ قریب سات کتابوں پر تبصرہ اور مختلف اداروں کی جدید مطبوعات کی فہرست بھی ہے، موضوع کے مطابق چند خبریں بھی جمع کر دی گئی ہیں۔ ہم اس مفید رسالہ کا خیر مقدم کرتے ہیں اور صاحب اداریہ کے اس احساس میں شریک ہیں کہ "اس رسالہ کے مثبت اثرات جلد یا بدیر ضرور رونما ہوں گے اور اردو داں حلقوں کا ذہنی جمود ٹوٹے گا۔" رسالہ کا زر سالانہ ستر روپے اور عام شمارہ کی قیمت دس روپے ہے، پتہ یہ ہے: اردو بک ریویو ۱۷۳۹/۳ بیسمنٹ، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

ترجمہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آئینہ کے مانند ہے، اگر آئینہ ذرا بھی دھندلا ہو تو

خوبصورت چہرہ بھی بدنما دکھائی دیتا ہے، سوامی ویویکانند کا یہ قول بھی مشہور ہے کہ ترجمہ تو کشمیری شال کا دوسرا رخ ہے، ترجمہ نگاری کے متعلق اس قسم کی باتیں ساہتیہ اکیڈمی کے ایک جلسہ میں سننے میں آئیں جہاں ہندوستانی زبانوں کے مترجمین کو ان کے ترجموں پر انعامات دیے گئے، اس موقع پر یہ احساس عام تھا کہ مغرب میں ترجمہ نگاری نے جو اعلیٰ فنی مقام حاصل کیا ہندوستانی ادب اس میں خاصا پیچھے ہے، یہاں ترجمہ کو اصل تالیف جیسی اہمیت نہیں حاصل ہوسکی اور مترجم کے متعلق یہی خیال رہا کہ وہ اصل کاوش کے محاسن کو ترجمہ میں قوت دانش کے ساتھ منتقل نہیں کرسکتا، جب کہ یورپ میں عمر خیام سے اس کے مترجم اسکاٹ فٹز جیرالڈ کی شہرت کم نہیں، اسی طرح ڈاکٹر ژواگو کے بورس پاسٹرنک اور بوڈلیئر ٹالسٹائی، چیخوف، دانتے، ملٹن اور شکسپیر کے مترجمین اصل مصنفین سے کم مقبول نہیں، ہندوستان میں ایسی مثالیں کم ہیں تاہم یہ ضرورت بھی شدت سے محسوس کی جاتی ہے کہ ہندوستان جیسے کثیر زبانوں والے ملک میں ترجمہ نگاری کی اہمیت زیادہ ہے کہ اس کے ذریعہ مختلف ہندوستانی زبانیں اور ان کا ادبی سرمایہ باہم قریب و متعارف ہوتا ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر ساہتیہ اکیڈمی نے ترجمہ نگاری ایوارڈ کا سلسلہ قریب چھ سال پہلے شروع کیا تھا، اس سال ۱۹ مترجمین کو ان کی سعی و کاوش کے اعتراف میں انعامات سے نوازا گیا، ترجمہ نگاری کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے ساہتیہ اکیڈمی مختلف شہروں میں ورکشاپ بھی منعقد کرتی ہے، اس کے نائب صدر رام کانت رتھ نے کہا کہ ترجمہ نگاری کا فن بھی گو وہبی ہے اکتسابی نہیں تاہم اس قسم کی ورکشاپوں سے مترجمین کی صلاحیت میں

اضافہ کی امید کی جاتی ہے، اکیڈمی نے ایک ٹرانسلیشن بیورو قائم کیا ہے اور یہ منصوبہ بھی تیار کیا ہے کہ یونیورسٹیوں کے نوجوان اساتذہ کو دوسری زبان سیکھنے کے لیے تیار کیا جائے تاکہ ایک مقررہ مدت میں محقق مترجموں کی ایک جماعت سامنے آجائے۔ ٹائمز آف انڈیا کی اس رپورٹ میں ہندی۔ کنڑ، مراٹھی۔ بنگالی، مراٹھی، اڑیہ کے ترجمہ نگاروں کا ذکر ہے لیکن اردو کے کسی مترجم کے نام سے یہ روداد خالی ہے۔

زبان و ترجمہ کے سلسلہ میں یہ خبر بھی ہے کہ ویانا میں قریب ستر ملکوں کے سماعت سے معذور افراد کا ایک نمائندہ اجتماع ہوا، جس میں دوسرے حقوق کے علاوہ یہ مطالبہ بھی خاص طور پر کیا گیا کہ اشاروں کی زبان کو باقاعدہ تسلیم شدہ زبان کی حیثیت دی جائے، یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف ۱۲ ملک ایسے ہیں جنھوں نے اشاروں کی زبان کو تسلیم کیا ہے، بہروں کی اس تنظیم کا یہ بارھواں جلسہ تھا، اس میں یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ اکثر ملکوں میں سماعت سے محروم اس طبقہ کو گونگا بہرہ کہہ کر یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ لوگ ذہنی لحاظ سے مختل و ناقص ہیں اور بامقصد زندگی گزارنے کے اہل نہیں، یہ صورت حال خاص طور پر ترقی پذیر ممالک کی ہے۔ جہاں بہرے پن کی جانب دوچند التفات کرنے کے بجائے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ خلل ہے دماغ کا، چنانچہ ان ملکوں میں ایسے ۸۰ فیصد بچے ہیں جو ضروری اور بنیادی تعلیم سے محروم رہتے ہیں، دو ہزار سے زیادہ نمائندوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اشاراتی زبان کی تعلیم کا خاص انتظام ہونا چاہیے تاکہ یہ معذور طبقہ ملازمتوں میں شریک ہوسکے اور تعلیم و صحت کے شعبوں میں خاص طور پر خدمات انجام دے سکے۔

عرصہ سے یورپ میں یہ منصوبہ زیر عمل تھا کہ ۱۹۴۵ء کے بعد شائع ہونے والی

ایسی ... کتابوں کا انتخاب کیا جائے جنھوں نے مغرب کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ مرکزی اور شمالی یورپ کے ناشرین کتب کے اس منصوبہ کا مقصد تھا کہ 'ذہن کی ایک مشترکہ منڈی کو پورے یورپ میں ترقی دی جائے'، ۱۹۸۶ء میں یہ کام شروع ہوا اور گذشتہ سال یہ پایۂ تکمیل کو پہونچا، منتخبات کی اس فہرست کے متعلق یہ خاص طور پر کہا گیا کہ یہ ایک با اصول اور آزادانہ انتخاب ہے، فہرست میں دو مصنفین ایسے ہیں جن کی دو دو کتابوں کو شمولیت کا اعزاز حاصل ہوا، ان کے علاوہ چرچل اور کافکا بھی اس میں شامل ہیں، ایک ہندوستانی اہل قلم امرتیا سین کی کتاب ریسورسز ویلیوز اینڈ ڈیلپمنٹ بھی ہے جو ۹۹ ویں درجہ پر ہے، حیرت ہے کہ یورپ کے ایک خاص طبقہ کے محبوب اور ان کے سایۂ عاطفت میں محفوظ رشدی و تسلیمہ اس زمرہ میں آنے کا شرف حاصل نہ کر سکے یعنی باوجود انتہائی شور و غوغا کے وہ ایسے اہل قلم میں شمار نہیں کیے جا سکے جنھوں نے اپنے افکار و خیالات سے مغرب کو متاثر کیا۔

امریکا اور یورپ کی معاشرتی زندگی کی خبروں میں اگر سامان عبرت ہوتا ہے تو ان کی علمی خبروں میں بصیرت کا سامان بھی ہوتا ہے، ایک ایسی ہی خبر میں مسی سیپی کی ایک گمنام ۸۷ سالہ خاتون اوسیولا میک کارٹی نے شہرت پائی۔ جنھوں نے اپنی ساری زندگی کپڑے دھو دھو کر ایک ایک پیسہ جمع کرنے میں صرف کی، ان کی یہ جمع پونجی آہستہ آہستہ ... ، ۱۵۰ ڈالر ہو گئی تو انھوں نے یہ خطیر رقم مسی سیپی یونیورسٹی میں مطالعہ و تحقیق کے لیے وقف کر دی اس طرح وہ علم نوازی میں ایک زندہ مثال بن گئیں۔

ایثار و سخاوت کی ایسی مثالوں کے ذریعہ ہی شاید محققین اور سائنسدانوں کو حوصلہ و فیضان ملتا ہے، اس کی تازہ مثال نابینا افراد کے لیے ایک تازہ بصری نظام کی ایجاد ہے، ڈاکٹر جوزف ونزوجو اس کارنامہ کے موجدین میں سے ایک ہیں، انھوں نے اس کی تفصیل ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے اس نظام میں آنکھ میں ایک ایسے کمپیوٹر کو نصب کیا ہے جو حجم میں کسی پیسہ میں لکھی ہوئی تاریخ کے چھوٹے سے ہندسہ کے برابر ہے، ایک چھوٹا ٹی وی کیمرہ اس کمپیوٹر کو غیر مرئی محدود لیزر اشارے بھیجتا ہے، کمپیوٹر آنکھ کے باریک اور نرم نسیجوں پر نہایت سبک روی سے تیرتا ہے اور یہ ان شمسی خلیوں سے طاقت حاصل کرتا ہے جو شمسی شعاعوں کے ذریعہ متحرک رہتے ہیں، پھر ان بصری اشاروں کو جو شمسی شعاعوں میں موجود ہیں۔ یہ کمپیوٹر الکٹرونی قوت ..... دے کر دماغ میں بھیج دیتا ہے جس کے نتیجہ میں مکمل نابینا افراد اگر کلی نہیں تو جزئی بصارت حاصل کر لیتے ہیں، یہ تفصیلات کسی سائنسی افسانہ یا فلم کا ناقابل یقین حصہ معلوم ہوتی ہیں لیکن ڈاکٹر جوزف نے اس کا جواب دیا کہ سائنسداں اس سے پہلے ایک الکٹرونی کن گھونگا (کان کے اندر کا پیچ در پیچ جوف) کو نصب کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں جس کی مدد سے مکمل بہرے افراد بھی سماعت کے لائق بن جاتے ہیں۔

حال ہی میں بیروت کے نزدیک کھدائی کے دوران ایک عظیم الشان شہر دریافت ہوا ہے، خیال ہے کہ اصلاً یہ کنعانی شہر تھا، ایک نوجوان کنعانی دوشیزہ کی جواہرات سے آراستہ نعش بھی ملی ہے اسکے علاوہ رومی پچی کاری، سنگی تابوت، یونانی سامان تدفین، اپولو کا ایک مجسمہ بھی ملا ہے، فصیل شہر اور قلعہ فنیقی طرز کا ہے، برتن اور دوسرے ساز و سامان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ... ۱۴۰۰ سال قبل مسیح کے ہیں۔

ع - ص -

وفیات

مولانا محمد اسحاق سندیلوی ندوی مرحوم

پاکستان سے یہ افسوسناک خبر بہت تاخیر سے ملی کہ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی ندوی کا نوّے سال کی عمر میں انتقال ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

مولانا کی تعلیم مدرسہ فرقانیہ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی، عرصہ تک وہ دارالعلوم میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، جب مولانا محمد ادریس نگرامی ندوی، ندوہ کے شیخ التفسیر تھے اس وقت مولانا سندیلوی شیخ الحدیث تھے اور ان دونوں جید اساتذۂ فن کی موجودگی ندوہ میں قران السعدین کا منظر پیش کرتی تھی، وہ ندوہ کے مہتمم بھی رہے اور وہاں کی مجلس اشاعت و تحقیقات شرعیہ کے ناظم بھی۔

درس و تدریس کے ساتھ ان کا تصنیفی ذوق اور تحریری مذاق اعلیٰ درجہ کا تھا، تاریخ و فقہ اسلامی پر ان کی نظر وسیع و عمیق تھی، ۱۹۴۷ء سے قبل مسلم لیگ کے ذمہ داروں کو خیال ہوا کہ متوقع اسلامی حکومت کا ایک قانون اساسی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مرتب کیا جائے تو اس کے لیے یوپی مسلم لیگ نے نظام اسلامی کے نام سے ایک مجلس کی تشکیل کی جس کے ارکان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا آزاد سبحانی جیسے جید علماء شامل تھے، مجلس کے روح رواں حضرت سید صاحب کی جوہر شناس نظر اس اسلامی قانون کے خاکہ و دستور کی ترتیب و تیاری کے لیے مولانا اسحٰق سندیلوی ہی پر پڑی جنھوں نے بڑی

خوش اسلوبی سے ایک ضخیم کتاب تیار کی جو بعد میں دارالمصنفین سے "اسلام کا سیاسی نظام" کے نام سے شایع ہوکر مقبول ہوئی اس میں انھوں نے نظریہ خلافت، قانون، حکومت، خلیفہ، مجلس تشریعی، رعایا، بیت المال، افتا، احتساب، حرب و دفاع، صوبائی حکومتیں، خارجی معاملات پر دور جدید کے سیاق و سباق میں فاضلانہ بحث کی اور سیاست کے غیر اسلامی نظریات کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی عالمانہ تبصرہ کیا، کتاب کی اہمیت کا اندازہ مولانا دریابادی کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ تحقیق، تفصیل و جامعیت کے لحاظ سے اس وقت اپنی نظیر وہ آپ ہی ہے، یہ کتاب کلامی و فقہی دونوں حیثیتوں کی حامل ہے لیکن فقہی پہلو زیادہ غالب ہے جس سے مولانا کو زیادہ شغف تھا، تحقیقات شرعیہ کی نظامت کے زمانے میں انھوں نے انشورنس اور رویت ہلال جیسے مسائل پر دعوت فکر دی اور کئی رسالے شایع کیے، ان کے مضامین ملک کے مختلف دینی و علمی رسائل میں بھی شایع ہوتے رہے۔ پاکستان تشریف لے جانے کے بعد کراچی کو وطن ثانی بنایا، کچھ مدت تک مولانا یوسف بنوری کے مدرسہ میں درس دیا لیکن قلم سے ان کا رشتہ آخر تک برقرار رہا، چند مہینے قبل ان کی مشہور کتاب اظہار حقیقت کے تین حصے معارف میں تبصرہ کے لیے موصول ہوئے ان کی یہ کتاب خلافت و ملوکیت کے رد میں شایع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی جس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، اس کتاب میں انھوں نے مشاجرات صحابہؓ اور حضرات عثمان و علی و معاویہ رضی اللہ عنہم اور حادثہ جمل و صفین کے بعض پہلوؤں کی وضاحت نہایت دیدہ ریزی و دیدہ وری سے کی، علامہ خمینی کے انقلاب ایران کے بعد انھوں نے خلافت و ملوکیت کے چند مباحث کا از سر نو جائزہ لے کر اس کی تیسری جلد بھی

مرتب کی۔ قادیانیت اور سبائیت کے رد و ابطال کے لیے بھی ان کا قلم وقف رہتا تھا اور اس سے ان کی اسلامی حمیت اور حضرات صحابہ کرامؓ سے غیر معمولی عقیدت و عظمت کی عکاسی ہوتی ہے، ان کتابوں کے علاوہ متعدد علمی رسائل لکھے، عربی اور انگریزی پر بھی دسترس تھی اور ان زبانوں میں بھی ان کی بعض کتابیں شایع ہوئیں، ان کو حضرت مولانا تھانوی سے بیعت و ارادت کا شرف بھی حاصل تھا اور مولانا عبد الشکور صاحب سے بھی خاص عقیدت تھی، شاہ وصی اللہ صاحب سے بھی بڑا تعلق رکھتے تھے، ان بزرگوں کا اثر ان کے خیالات اور زندگی سے عیاں تھا۔

ذاتی لحاظ سے وہ شرافت اور مکارم اخلاق کا نمونہ تھے، ان کی پُر وقار شخصیت، دلنواز گفتگو، متبسم چہرہ اور نرم لب و لہجہ ندوہ کے ہر طالب علم کے لیے سرچشمۂ لطف و کرم تھا، ندوہ میں ان کی موجودگی کا خاص احساس وہاں کی مسجد میں ان کی امامت سے ہوتا تھا، وہ سند یافتہ قاری تھے، فجر کی نماز میں جب وہ پُرسوز و معتدل آواز میں تلاوت کرتے تو اس میں محض تجوید کا فن نہیں ہوتا بلکہ اس شبنم کی ٹھنڈک اور تازگی کا احساس ہوتا ہے جو لالہ کے جگر کو خنکی بخشتی ہے۔ ان کے تقویٰ و للّٰہیت کا چرچا آج بھی ان کے شاگردوں کی زبان پر ہے، ان کے باطن کا نور ان کے ظاہر سے بھی جھلکتا تھا، دراز قد کے ساتھ ان کی کشیدہ قامتی اور ان کا سرخ و سفید چہرہ اور اس پر دلآویز زلفوں کی لٹ ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہے گی، اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کو بلند درجات سے سرفراز فرمائے۔

مولانا پروفیسر محمد اشرف خاں سلیمانی مرحوم

دار المصنفین میں یہ خبر بھی نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ حضرت مولانا

سید سلیمان ندوی کے عاشق صادق اور ان کے مرید و خلیفہ مولانا محمد اشرف خاں ستمبر کے مہینہ میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

وہ پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر، ایک عربی مدرسہ کے ناظم، خطیب اور مصلح و مرشد اور حضرت سید صاحب کے خاص فدائی تھے، سید صاحب کے جلوہ ہائے حسن جاناں کو انہوں نے کچھ اس طرح جذب کر لیا تھا کہ انہی کو سب پکار اٹھیں گنہ رجائیں جدھر ہو کر۔ اسی لیے اپنے نام کے ساتھ نسبت سلیمانی لکھنے کا التزام کیا اور اپنی قیام گاہ کو سلیمان اکاڈمی کا نام دیکر خود کو علوم و معارف سلیمانی کا فیض عام کرنے کے لیے وقف کر دیا، اس کا ثبوت ان کی کتاب "سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت" ہے، یہ پہلے ۵۵-۱۹۵۶ء میں معارف میں مضمون کی صورت میں چھپی جس کی داد اہل نظر نے دی تو اسی کو مزید تفصیل و اضافہ کے بعد کتابی شکل میں شایع کیا جس کے بارے میں مولانا دریابادی نے لکھا کہ "کتاب صحیح نمونہ ماقل و دل ہے ... سلوک سلیمانی بلکہ سلوک اشرفی کا ایک جامع دستور العمل ... لطیف، سلیس، شگفتہ اور انداز بیان دلچسپ و پُرمزہ" ان کے اس البیلے اور شگفتہ طرز کی داد مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے یہ لکھ کر دی کہ "مولانا اشرف خاں صاحب کا فطری جوہر کہیے یا سید صاحب کی ارادت و صحبت کا فیض کہ تحریر کی شگفتگی اور شیرینی کہیں ساتھ نہیں چھوڑتی یہ دراصل علامہ شبلی کی وہ میراث ہے جس سے نہ مولانا عبد الباری ندوی اپنی کامل اشرفیت و تقشف کے باوجود آزاد ہو سکے اور نہ سید صاحب اپنی کامل فنائیت اور طبیعت کی افسردگی کے باوجود"

معذوری کے باوجود سید صاحب سے بے پناہ عقیدت ان کو سینکڑوں میل کا

فاصلہ طے کرکے پشاور سے دوبارہ اعظم گڈھ کھینچ لائی، انکو دیکھ کر یقین نہ آیا کہ اس حالت میں کوئی اتنے طویل سفر کی ہمت بھی کر سکتا ہے، انکا نصف زیریں حصہ بالکل مفلوج تھا، پہیوں والی کرسی ہمہ وقت انکے ساتھ رہتی یا پھر انکے شاگرد اور مسترشد انکو گود میں لیکر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے، اسکے باوجود انہوں نے دارالمصنفین کے در و دیوار کو اور سید صاحب کے آثار و باقیات کو جن آنکھوں سے دیکھا اور مس کیا اسکا مشاہدہ ناقابل فراموش ہے، اب وہ وہاں ہیں جہاں انکی روح اپنے محبوب مرشد کی روح سے ہمکنار ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پاک روحوں پر اپنے لطف عمیم کا سایہ دراز فرمائے، معلوم ہوا کہ انکی نماز جنازہ میں لاکھوں کا ہجوم تھا جو انکی مقبولیت کی دلیل ہے۔

مولانا سید محمد مرتضیٰ مظاہری مرحوم

ندوۃ العلماء کے کتبخانہ شبلی کے ناظر مولانا سید محمد مرتضیٰ مظاہری بھی ۳ اور ۴ نومبر کی درمیانی شب میں لکھنؤ میں انتقال فرما گئے، وہ تقریباً چالیس برس تک ندوہ کے کتبخانہ کی ترقی و تزئین کیلئے وقف رہے، لائبریری سائنس کی کسی مروجہ عصری سند کے بغیر انہوں نے جس طرح اس کتبخانہ کو ملک کا بہترین کتبخانہ بنایا وہ اپنی مثال آپ ہے، انہوں نے عرصہ تک ندوہ کے مدرسہ ثانویہ اور دارالاقامہ سلیمانیہ میں آتالیق و مربی کے فرائض بھی انجام دیئے، ندوہ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے انکو عشق تھا، ندوہ کیلئے انہوں نے کثرت سے سفر کیئے، نہایت مرنجاں مرنج، خوش اخلاق، ہنس مکھ اور خلیق و شفیق تھے، دارالمصنفین سے بھی انکو خاص تعلق تھا، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم جب بابری مسجد مرتب کر رہے تھے تو مولانا نے بڑی دلچسپی سے انکو ضروری مخطوطات و کتابیں مہیا کیں جنکا اعتراف کتاب کے مقدمہ میں کیا گیا ہے، گذشتہ مہینہ جب دارالمصنفین میں رابطہ ادب اسلامی کے سمینار کا اعلان ہوا تو وہ اس میں شریک ہونے والے تھے، لیکن قضا و قدر نے اس سے پہلے ہی ان کو اپنے خالق حقیقی کے حضور میں بلا لیا، اللہ تعالیٰ پس ماندگان کو صبر جمیل اور مولانائے مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ع۔ ص۔

مطبوعات جدیدہ

طب قدیم کا مبحث مزاج انسان

از جناب حکیم افتخارالحق

تکمیلی متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت مناسب، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۴، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: نسیمہ کالج، توپ دروازہ، لکھنؤ ۳۔۔ ۲۲۶۔

طب قدیم کا ایک اہم اور بنیادی موضوع انسان کا مزاج ہے، بدن اور اعضائے انسانی کے مزاج، اعتدال، اختلاف عمر کا اس پر اثر، مرد و عورت کے مزاج کا فرق، خون کی کمی بیشی کا اثر، سرد و گرم ملکوں کے انسانوں کی مزاجی کیفیات کا تغیر وغیرہ اس کے وہ مباحث ہیں جن پر اطباء نے خاص توجہ دی ہے، اس کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ خاص اس موضوع سے صرف نظر کرنے کی صورت میں طب قدیم کی وہ عمارت ہی منہدم ہو سکتی ہے جو حفظان صحت، امراض، علاج اور ادویہ کی بنیاد پر قائم ہے، شیخ بوعلی سینا کی کلیات قانون کا موضوع مزاج انسان ہے، جن کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں، لیکن اس کی صحیح اور درست تعبیر و تشریح فاضل مولف کے نزدیک ابھی تک نہیں ہو سکی، چنانچہ انہوں نے اس کی شرح لکھنے کا ارادہ کیا، مگر پھر یہ زیادہ مناسب خیال کیا کہ اس کے مبحث مزاج انسان پر خود داد تحقیق دیں۔ اس مقصد میں فاضل مولف کس درجہ کامیاب ہیں اس کے متعلق کوئی صاحب فن ہی اظہار خیال کر سکتا ہے، تاہم اس کتاب کے ذریعہ اردو کے ذخیرہ میں اس موضوع پر مفید کتاب کا اضافہ ہوا ہے، مگر کتابت و طباعت غیر معیاری ہے، خصوصاً عربی عبارتوں کی کتابت میں زیادہ سہو نظر آتا ہے، اس پر بھی توجہ کرنے کی ضرورت تھی کہ عبارتوں میں

بے ربطی نہ ہو "ہولا تا کمثل کی یہ جبلی عبارت" مسئلہ مزاج میں تمام دوسرے غلط فہمیوں کا سلسلہ

اس کا نقص اور سقم واضح ہے۔

تاریخ تہذیب اسلامی (عہد جاہلی وعہد نبوی) از جناب

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت وطباعت، صفحات ۲۳۹ قیمت ۳۵ روپے، پتہ: قاضی پبلشرز ڈسٹری بیوٹرز، وینچ بلڈنگ، حضرت نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۳۔

یہ تاریخ دراصل تاریخ اسلام کی جدید تدوین اور درس وتدریس کے نئے تقاضوں کی خاطر ایک نصابی سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں زمانہ نبوت کے واقعات کے ساتھ دور جاہلی واسلامی کی تاریخ وتہذیب کو عام روایتی انداز سے ہٹ کر علمی نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ اسلام کے فلسفہ تاریخ اور اس کی تہذیب وتمدن کا ایک واضح تصور سامنے آجائے، اس کے لیے قریب ۱۲ ابواب میں عربوں کے دور جاہلیت ان کے قبائلی، سماجی اور سیاسی نظام اور ان کے تمدن کا جائزہ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی ومدنی عہد کا مطالعہ کیا گیا ہے، اسلامی معاشرہ وریاست وحکومت پر بحث ہے اور آخر میں سیرت طیبہ کا ایک مجموعی تجزیہ کیا گیا ہے، فاضل مولف کی قدیم وجدید تاریخ نویسی پر گہری نظر ہے اور درس وتدریس کا وسیع تجربہ بھی ہے نیز وہ تاریخ کے اسلامی اور غیر اسلامی نظریات کے فرق واختلاف سے واقف ہیں اس لیے یہ کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور یہ صرف طالب علموں کے لیے ہی نہیں عام قارئین کے لیے بھی یکساں مفید ہے۔

علیم صاحب

از جناب پروفیسر محمد سالم قدوائی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت، طباعت عمدہ، مجلد مع گردپوش، صفحات ۳۴۴، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور مشہور دانشور پروفیسر عبد العلیم مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان تھے، مذہبی وسیاسی نقطہ نظر سے اختلاف کے باوجود وہ ہر طبقہ میں محترم اور ہر دلعزیز تھے، لیکن تعجب ہے کہ ان کی شخصیت وسوانح پر کوئی شایان شان کتاب شایع نہیں ہوئی، خوشی ہے کہ اس ضرورت کو اسی شعبہ علوم اسلامیہ نے محسوس کیا جس کے وہ پہلے ڈائرکٹر تھے، لائق مرتب نے علیم صاحب کے اعزہ واحباب اور ان کے شاگردوں سے مضامین لکھوائے اور ان کو سلیقہ سے پیش کردیا، کتاب کو تینوں حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصہ میں صاحب سوانح کے متعلق اور دوسرے حصہ میں ان کی علمی خدمات مثلاً عقیدہ اعجاز قرآن کی تاریخ اور سیرت نبوی اور مستشرقین پر تحریریں ہیں، تیسرے حصہ میں حاصل مطالعہ کے عنوان سے علیم صاحب کے چار مضامین نقل کیے گئے ہیں، سوانحی مضامین میں علیم صاحب کی صاحبزادی کا مضمون خاص طور پر موثر اور مفصل ہے اور مضامین کے علاوہ خود مرتب کتاب کی تحریر بھی دلچسپ ہے۔

زکوۃ اور مصالح عامہ

از جناب مولانا محمد شہاب الدین ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت وطباعت، صفحات ۹۷، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، ۱۶۵، داسرہلی، بنگلور ۵۶۰۰۵۷۔

زکوۃ کے مصارف میں ایک اہم مصرف "فی سبیل اللہ" کے مفہوم کی تشریح وتعیین میں اس کتاب کے فاضل مولف کا یہ مسلک اب معروف ہے کہ اسکو شریعت کی

حکمت و مصلحت کے پیش نظر مبہم یا غیر محدود ہی رکھا گیا ہے تاکہ دین و شریعت کو مضبوط کرنے کی غرض سے جو امور مناسب و ضروری ہوں وہ اس میں شامل ہوتے رہیں، اپنے مسلک کی تائید میں ان کے نزدیک دلائل بھی ہیں لیکن علماء کا ایک طبقہ اس وسعت و عمومیت کے خلاف ہے، زیر نظر کتاب میں ایسے ہی چند اختلافات کا جائزہ و جواب ہے، اس سے پہلے بھی انکی کئی کتابیں اس موضوع پر شایع ہو چکی ہیں، اس کتاب کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔

وہ ذہن جس کی تعمیر قرآن کرتا ہے

از جناب سید عبد اللطیف مرحوم

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۴۶، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: قادریہ نشیمن ترپ بازار، حیدرآباد ۱ ..... ۵۔

اس نہایت فکر انگیز، عالمانہ اور مفید کتاب کے مولف مرحوم کو قرآنی علوم سے خاص شغف تھا، وہ نہایت وسیع النظر فاضل تھے، بجا طور پر ان کی یاد میں ایک ٹرسٹ برائے قرآنی و دیگر تہذیبی مطالعہ قائم کیا گیا ہے، اسی کی جانب سے یہ کتاب ایک عرصہ بعد دوبارہ شایع کی گئی ہے، اصل کتاب انگریزی میں تھی اور اس کے مخاطب خاص طور پر مستشرقین اور مغرب زدہ ذہن تھے، یہ ۱۹۵۳ء میں شایع ہوئی، دو سال بعد اس کا اردو ترجمہ شایع ہوا، اور چند سال پہلے اس کا ایک نیا ایڈیشن پاکستان میں طبع ہوا، زیر نظر طبع جدید بھی آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور مشیت الہی، عمل صالح، حیات مابعد، امت وسط کے عنوان سے قرآن مجید کی بعض اہم تعلیمات کی وضاحت و ترجمانی کی گئی ہے، ایک باب میں "قرآن قرون وسطیٰ کے شکنجہ میں" بھی ہے اور یہ بہت خوب ہے، ایک مضمون پس چہ باید کرد میں اسلام اور کمیونزم کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، کمیونزم کی شکست و ریخت کے بعد بھی ان کی اہمیت برقرار ہے۔

ع۔ ص۔